ایک نواب صاحب کی ڈائری

اور

دوسرے مضامین

مرزا فرحت اللہ بیگ

عبدالحق اکیڈیمی

اشاعت منزل - اردو گلی - حیدرآباد (دکن)

دسمبر ۱۹۳۳ء

قیمت ۱۲ر

مطبع مکتبہ ابراہیمیہ

فہرست مضامین

عرضِ ناشر

تاریخ ادبِ اُردو میں دلّی کو جو اہمیت حاصل ہے وہ پھر کسی شہر کو میسّر نہ ہو سکی، دلّی کی زبان، دلّی کا اندازِ بیان اور دلّی کے خاص خاص انسان سارے ہندوستان کی جان رہے ہیں۔

اِسی خاکِ پاک سے حضرت شاہ عبدالقادرؒ جیسے جلیل القدر بزرگ پیدا ہوئے جنھوں نے اردو کی تنگ دامانی کے زمانے میں قرآن پاک کا ترجمہ کر کے اُردو کے دامن کو مرصع و زرنگار بنایا۔

اسی سرزمین سے غالب جیسا عظیم المرتبت شاعر اُٹھا کہ جس نے شعر و سخن میں نئی راہیں پیدا کیں اور گیسوئے اُردو کو نئے طرز پر سنوارا۔

اسی مقام کو مومن جیسے نازک خیال سخنور کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے جس کی نازک خیالیوں اور شاعرانہ پہنائیوں نے آج کی ترقی یافتہ دنیا سے بھی اپنا لوہا تسلیم کرایا۔

یہ ہی سرزمین مولوی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد اور اُردو کے دوسرے نامور خادموں کا مولد و مدفن ہے کہ جنھوں نے اپنی ساری عمریں اُردو کی خدمت گزاری میں صرف کیں۔

جناب محترم مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بھی اِسی مردم خیز سرزمین کے گوہر گراں مایہ ہیں جنھوں نے اپنے ادب، اپنی انشا پردازی اور اپنی معنی خیز مزاحیہ نگاری سے دلّی کے نام کو روشن کیا۔

وہ سالہا سال سے دلّی سے دُور ہیں لیکن دلّی ان سے دُور نہیں۔ دلّی والے

شاید ان کو بھول چکے ہوں مگر وہ نہ دلّی کو بھولے اور نہ دلّی کی زبان کو۔

مضامینِ فرحت میں انھوں نے کہیں ہنساتے ہوئے اور کہیں سنجیدگی و متانت سے دلّی کے محاوروں، دلّی کے طرزِ بیان اور زبان کو اپنے خاص اسلوب سے اجاگر کیا ہے۔

"مضامین فرحت" کا ہر مضمون دلّی کی قدیم تہذیب، قدیم معاشرت اور وہاں کی ادبی تاریخ کا آئینہ دار ہے۔

اس پورے سلسلے میں مرزا صاحب نے اپنے سحر آفریں قلم سے دلّی کے قدیم ماحول کی وہ دل آویز تصویریں کھینچی ہیں کہ سو برس کی دلّی اور دلّی والے سامنے آجاتے ہیں اور پڑھنے والوں کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ قدیم دلّی کی فضاؤں میں سانس لے رہا ہے۔

عبدالحق اکیڈمی کے لیے باعث فخر ہے کہ وہ مضامین فرحت کے پورے سلسلے کو سات حصّوں میں کراؤن سائز پر دیدہ زیب کتابت و طباعت کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کر رہی ہیں۔

مضامین فرحت کے پہلے ایڈیشنوں میں عام طور پر یہ غلط فہمی رہی کہ یہ سلسلہ ایک دوسرے کی ایسی کڑی ہے کہ پورے حصّوں کے بغیر کتاب کا مطالعہ نامکمل رہتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ ہر حصّہ مضامین کے اعتبار سے اپنی جگہ پر مکمل ہے اور ایک حصّہ کا دوسرے حصّے سے کوئی تعلق نہیں ہر حصّہ کا پڑھنے والا اپنے مطالعہ میں کسی قسم کی تشنگی محسوس نہیں کرتا اور اپنے مطالعہ کی تکمیل کے لیے دوسرے حصّوں کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی یہ دوسری بات ہے کہ مرزا صاحب کا نام تحریر اور طرزِ نگارش کی دلکشی آپ کو دوسرے حصّوں کے مطالعہ کے لیے مجبور کر دے

علی شبر حاتمی

اکثر اہلِ قلم نکتہ چینی کے خوف سے کسی بھاری بھر کم نام کا سہارا لیے بغیر میدانِ اشاعت میں قدم رکھنے سے ہچکچاتے ہیں۔ مگر اے میرے آزاد خیالات کے غیرتمند صحیفوں تم اپنے اوپر کم ہمتی کا یہ تمغہ نہ لگاؤ۔ اپنے بل بوتہ پر مقابلہ کے لیے میدان میں اُتر جاؤ، خود ہنسو، دوسروں کو ہنساؤ۔ اگر کوئی سمجھ دار پڑھنے والا مل جائے تو اُس کے کتب خانہ کی زینت بڑھاؤ، ورنہ کسی نا اہل کے ہاتھوں شہید ہو کر پنساری کی پڑیوں میں کام آؤ۔

مرزا الم نشرح

''مضامین فرحت'' کے جو پہلے اڈیشن نکلے تھے۔ ان کی کاپیوں کی میں نے خود صحت کی تھی۔ اس لیے ان میں کتابت کی غلطیاں تو ضرور تھیں۔ مگر بہت کم۔ اس کے بعد ان مضامین کے جو اڈیشن ''یاروں'' نے نکالے ان کی کچھ نہ پوچھو۔ بس۔ یہ سمجھ لو کہ اڈیشن کیا تھے۔ ''بالکل غیر ذمہ دارانہ کارروائیاں'' تھیں۔ اب عبدالحق اکاڈیمی ان مضامین کا ایک نیا اڈیشن نکال رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ کتاب کا سایز بھی اچھا ہوگا۔ خط بھی اچھا ہوگا اور غلطیاں بھی نہ ہونگی۔ غلطیاں نہ ہونے کا تو میں قایل نہیں۔ قرآن مجید کے لکھنے میں جب کاتب غلطیاں کرنے سے نہیں جھجکتے تو بھلا میرے مضامین کس گنتی میں ہیں۔ اگر گنتی کی غلطیاں ہی رہ گئیں تو میں غنیمت جانونگا۔ ان مضامین کی صحت کرکے اور کچھ گھٹا بڑھا کر دے رہا ہوں۔ اگر کاتب صاحب ''نقل راچہ عقل'' ہی پر عمل کریں گے تو میں سمجھوں گا کہ ''واللہ کمال کیا''۔
''مضامین فرحت'' کے اب تک چھ حصے چھپے ہیں۔ مگر

لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ یہ ایک دوسرے کا تکملہ ہیں۔ دراں حالیکہ ہر حصّہ اپنی حد تک مکمل ہے۔ اسی غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے اب ہر حصّہ کا نام علیٰحدہ رکھا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی کیا گیا ہے کہ جو دو تین مضامین۔ دو مختلف حصّوں میں آئے تھے ان کو ایک جگہ کر دیا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر ان مضامین کے متعلق کوئی غلط فہمی ہو تو اس کا میں ذمہ دار نہیں ہوں۔

مجھ سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نوعیت کے لحاظ سے ان مضامین کی تقسیم کر دی جائے لیکن میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔ کیونکہ کتاب میں ایک ہی قسم کے مضمون پڑھتے پڑھتے طبیعت تھک جاتی ہے۔ اس لیے اچھا بھی معلوم ہوتا ہے کہ مختلف قسم کے مضمونوں کو اس طرح سمو دیا جائے کہ پڑھنے میں طبیعت پر بار نہ ہو۔ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ کوئی اس کو پسند کرے یا نہ کرے۔

کمترین

مرزا فرحت اللہ بیگ

اور
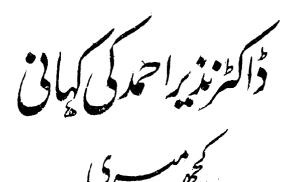
کچھ اُن کی زبانی

اللہ اللہ، ایک وہ زمانہ تھا کہ میں اور دانی[1] مولوی صاحب مرحوم کی باتیں سنتے تھے ان کی ہمت ہماری ہمت بڑھاتی تھی، اُن کا طرزِ بیان ہماری تحریر کا رہبر ہوتا تھا، ان کی خوش مذاقی خود اُن کو ہنساتی اور ہمارے پیٹ میں بل ڈالتی تھی۔ اُن کی تکلیفیں خود اُن کو پُرنم کرتیں اور ہم کو تڑپاتی تھیں، اور آج وہ دن ہے کہ اُن کے حالات زبان قلم پر لانے سے

---

[1] یہ وہی مولوی غلام یزدانی صاحب او۔ بی۔ ای ہیں۔ جو آثار قدیمہ کے متعلق اپنی واقفیت میں جواب نہیں رکھتے۔ میاں دانی کے نام کی صراحت کرنے کی اس لیے ضرورت پڑی کہ ایک پروفیسر صاحب نے لفظ "دانی" کے معنی بیان کیے جو میرے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھے۔ اس واقعہ کو سُن لیجیے۔ بڑے مزے کا ہے۔ مولوی نذیر احمد مرحوم والا مضمون بی۔ اے کے کورس میں تھا۔ ایک پروفیسر صاحب پڑھا رہے تھے کسی طالب علم نے سوال کیا کہ "جناب۔ یہ دانی۔ کون صاحب ہیں" پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ "دانی کسی شخص کا نام نہیں ہے۔ یہ لفظ دانستن سے مشتق ہے اور اس کے معنی ہیں۔ "آگہی" جس طرح شعراء نے ایک ہستی "سروش" پیدا کر لی ہے اسی طرح اس مضمون کے مصنّف نے "آگہی" یعنی "عقل" کو اپنے ساتھ درس میں شریک کیا ہے"۔ سُنے۔ آپنے "دانی" کے معنی۔ اب اگر اس لفظ کی صراحت نہ کروں تو کیا کروں۔ ڈر ہے کہ کوئی اور پروفیسر صاحب اس کے کچھ اور عجیب و غریب معنی بیان نہ کر بیٹھیں۔

ڈر لگتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ بزرگ ہستی "اخوت اسلامی" کا سبق پڑھے ہوئے تھی، اُس کو اپنے بل بوتے پر ترقی کرنے پر ناز تھا، وہ چھوٹے درجہ سے بڑے درجہ پر ترقی کرنا اپنا کارنامہ سمجھتی تھی۔ اُس نے جو کچھ کیا اور جو کچھ کر دکھایا، وہ کسی کی خوشامد، کسی کی سفارش یا کسی خاندانی وجاہت کے باعث نہ تھا، وہ تھا اور دنیا کا وسیع اکھاڑا، وہ اپنے دست و بازو کے بھروسے پر اس میدان میں اُترا، ہر مصیبت کا سامنا اپنی ذاتی قابلیت و ہمت سے کیا۔ جس کام میں ہاتھ ڈالا اس کی تکمیل میں خون پانی ایک کر دیا۔ اور دنیا پر بخوبی ثابت کر دیا کہ بے یاری و مددگاری ترقی کی راہ میں ایسی رکاوٹیں نہیں ہیں جو بآسانی ہٹائی نہ جاسکیں اور خاندانی تعلقات کی عدم موجودگی ایسی چیز نہیں ہے جو مانع ترقی ہو سکے۔ جب کبھی جوش میں آتے تو ہمیشہ (I am a self - made man) کا فقرہ ضرور استعمال کیا کرتے، اور جب کبھی اس پہلو پر نصیحت کرتے تو ہمیشہ یہی فرماتے کہ بیٹا جو کچھ کرنا ہے خود کرو، باپ دادا کی ہڈیوں کے واسطے سے بھیک نہ مانگتے پھرو۔

انسان فطرت سے مجبور ہے، جب دنیا کی نظریں اُس پر پڑنے لگتی ہیں تو وہ ہمیشہ اپنی پہلی حالت کی کمزوریوں کو چھپاتا اور خوبیوں کو دکھاتا ہے۔ جس طرح بڑے بڑے گھرانوں کی نا اہل اولاد اپنے باپ دادا کے نام سے اپنی نالائقی کو چھپاتی ہے اسی طرح غریب گھرانوں کی لایق اولاد چاہتی ہے کہ اُن کے باپ دادا کے نام لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائیں یہ ہے ہماری اخلاقی کمزوری اور یہ ہے ہماری اسلامی سبق
[illegible]

اصلی رنگ میں دکھاتے اور اس پر فخر کرتے تھے، اُن کو اپنی ابتدائی غربت پر ناز تھا اور اکثر کہا کرتے تھے کہ میاں اگر لفٹنٹ گورنر کے بیٹے ہو تو کم سے کم ڈپٹی کمشنر تو ہو جاؤ۔ دس روپئے کے اہلکار ہو کر باپ کو لفٹنٹ گورنر کہتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آتی۔

بہرحال یہ فطرت انسانی کا خیال تھا جس نے اب تک مجھے مولوی صاحب مرحوم کے حالات لکھنے سے روکا، بہت کچھ لکھ لیا تھا وہ پھاڑ ڈالا کہ کہیں ایچن چھوڑ گھسٹین میں نہ پڑ جاؤں، رہ رہ کر جوش آتا تھا اور ٹھنڈا پڑ جاتا تھا، خدا بھلا کرے مولوی عبدالحق صاحب کا کہ انھوں نے مجھے اس "اگر۔ مگر" سے نکالا، اور دل کی باتوں کو حوالۂ قلم کرنے پر آمادہ کر دیا اب جو کچھ کانوں سے سُنا اور آنکھوں سے دیکھا ہے وہ لکھوں گا اور بے دھڑک لکھوں گا، خواہ کوئی بُرا مانے یا بھلا۔ جہاں مولوی صاحب مرحوم کی خوبیاں دکھاؤں گا وہاں اُن کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کرونگا تاکہ اس مرحوم کی اصلی اور جیتی جاگتی تصویر کھنچ جائے، اور یہ چند صفحات ایسی سوانح عمری نہ بن جائیں جو کسی کے خوش کرنے یا جلانے کو لکھی گئی ہو، میں واقعات کے بیان کرنے میں کوئی سلسلہ بھی قائم نہ کروں گا کیونکہ یہ بناوٹ کی صورت ہے جس موقع پر جو کچھ سُنا یا دیکھا اُس کو جوں کا توں لکھ دوں گا، اور ہمیشہ اس امر کی کوشش کروں گا کہ جہاں تک ممکن ہو واقعات مولوی صاحب ہی کی زبان میں بیان کیے جائیں۔ انشاء اللہ واقعات کے اظہار میں مجھ سے غلطی نہ ہوگی، ہاں یہ ممکن ہے کہ بعض نام بھول جانے کی وجہ سے چھوڑ جاؤں، یا غلط لکھ جاؤں، اب رہا سچ یا جھوٹ تو اس کی مجھے پروا نہیں۔

میں اپنے محترم اُستاد کے حالات لکھ رہا ہوں، اگر سچ ہیں تو میں اپنا فرض
ادا کر رہا ہوں، اگر جھوٹ ہیں تو وہ خود میدان حشر میں سود در سود
لگا کر تاوان وصول کرلیں گے۔

اب رہا طرزِ بیان تو میں اس میں متانت کو بالائے طاق رکھ دیتا
ہوں۔ کیونکہ مولوی صاحب جیسے خوش مذاق آدمی کے حالات لکھنے
میں متانت کو دخل دینا ان کا منہ چڑانا ہی نہیں اُن کی توہین کرنا ہے۔
بلکہ یوں کہو کہ سیّد انشا کو میر اور مارک ٹوئین کو امرسن بنانا ہے۔ جب
اپنی زندگی میں انھوں نے میری شوخ چشمی کی ہنس ہنس کر داد دی تو
کوئی وجہ نہیں کہ اب وہ اپنی وضعداری کو بدل دیں اور میری
صاف گوئی کو گستاخی قرار دے کر دعوے دار ہوں۔ تو پھر

چل رے خامہ بسم اللہ

۱۹۰۳ء میں میاں دانی نے اور میں نے ہندو کالج دہلی سے
ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا اور دونوں مشن کالج میں داخل ہوگئے،
ایف۔ اے میں میرا مضمون اختیاری سائنس اور دانی کا عربی تھا،
انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ بی۔ اے میں عربی لے لو، دونوں کو
ایک دوسرے سے مدد ملے گی، اور امتحان کی تیاری میں سہولت
ہوگی، مجھے اپنے حافظہ پر گھمنڈ تھا۔ یہ بھی نہ سمجھا کہ اس مضمون کو
سنبھال بھی سکوں گا یا نہیں، جھٹ راضی ہوگیا۔ القصہ ہم دونوں
بی۔ اے کے درجۂ ابتدائی میں شریک ہوگئے، ہمارے ع[illegible]

پروفیسر مولوی جمیل الرحمٰن صاحب تھے، بڑے اللہ والے آدمی تھے۔
عربی کا گھنٹہ بآسانی تصوّف کی باتوں میں گزر جاتا تھا۔ کچھ تھوڑا بہت
پڑھ بھی لیتے تھے۔ دانی کچھ سمجھتے ہوں تو سمجھتے ہوں، کمترین تو طوطے
کی طرح حفظ کر لیتا تھا۔ اب رہی صرف و نحو اس میں تو میں کورے
کا کورا ہی رہا، سنتے آئے ہیں کہ "مصیبت کہہ کر نہیں آتی"، لیکن
یہ نہیں سُنا تھا کہ "عربی کے پروفیسر بغیر کہے چلے جاتے ہیں" ایک
دن جو مولوی صاحب کے کمرے میں ہم دونوں پہنچے تو کیا دیکھتے
ہیں کہ کمرہ خالی پڑا ہے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب
کل شام کو استعفاء دے کر کعبۃ اللہ چل دیے۔ پرنسپل صاحب کے
پاس پہنچے، اُن سے پوچھا کہ دوسرے صاحب کب آتے ہیں، تو
انھوں نے کورا جواب دے دیا کہ ہم عربی کی جماعت کا بندوبست
نہیں کر سکتے، بہتر یہ ہے کہ مضمون تبدیل کر لو، میں نے دانی سے
کہا کہ بھئی تمھارے کہنے سے میں نے عربی لی تھی، اب میرے کہنے
سے تم سائنس لے لو، جس سہولت کی بناء پر تم نے میرا مضمون بدلوایا
تھا اب اسی سہولت کے مدّ نظر اپنا مضمون بدلو، بقول شخصے کہ "مرتا
کیا نہ کرتا" وہ راضی ہو گئے دفتر میں جا کر جو لکچروں کا حساب کیا
تو معلوم ہوا کہ مضمون تبدیل کرنے کا وقت نہیں رہا۔۔ لکچر
کم رہ جائیں گے اور اس طرح بجائے دو سال کے تین سال میں
شریک امتحان ہونا پڑے گا، غرض سنگ آمد و سخت آمد۔ جب
"وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دوکان اپنی بڑھا گئے" کی صورت
آپڑی تو دوسرے ٹھکانے کی تلاش ہوئی۔ دونوں سر ملا کر بیٹھے

مشورے کیے، ریزولیوشن پاس ہوئے۔ آخر تجویز پاس ہوئی کہ "خاک از تودۂ کلاں بر دار" مقولے پر عمل کر کے کسی زبردست مولوی کو گھیرنا چاہیے، دلّی میں دو تین بڑے عربی داں مانے جاتے تھے۔ ایک مولوی محمد اسحٰق صاحب، دوسرے شمس العلماء مولوی ضیاءالدین خاں صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی اور تیسرے نذیر احمد صاحب، پہلے کو دیوانگی سے فرصت نہ تھی۔ اس لیے وہاں تو دال گلتی معلوم نہیں ہوئی۔ قرعہ دوسرے صاحب کے نام پر پڑا، گرمیوں کا زمانہ تھا، مولوی ضیاءالدین صاحب جامع مسجد میں رات کے دس گیارہ بجے تک بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے تھے، ہم دونوں نے بھی جاکر شام ہی سے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ڈیرے ڈال دیے۔ آٹھ بجے، نو بجے، دس بج گئے مولوی صاحب نہ آج نکلتے ہیں نہ کل، خدا خدا کر کے دروازے سے قندیل نکلتی ہوئی معلوم ہوئی، ہم دونوں بھی ہاتھ پاؤں جھٹک خوشامد کے فقرے کے فقرے سوچ کھڑے ہو گئے ہم آخری سیڑھیوں پر کھڑے تھے، اس لیے دروازے میں سے پہلے قندیل نکلتی نظر آئی، اس کے بعد جس طرح سمندر کے کنارے سے جہاز آتا دکھائی دیتا ہے اسی طرح پہلے مولوی صاحب کا عمامہ، اس کے بعد ان کا نورانی چہرہ، سُرمگیں آنکھیں، سفید ریش مبارک، سفید جُبّہ اور سب سے آخر زردبانات کی سلیم شاہی جوتیاں نظر آئیں، آہستہ آہستہ اُنھوں نے سیڑھیوں سے اُترنا اور اُوپر تلے ہمارے سانس نے چڑھنا شروع کیا۔ ہم سوچتے ہی رہے کہ راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں وہ سٹ سے

پاس سے نکل گئے۔ آخر ذرا تیز قدم چل کر اُن کو جا لیا، اور نہایت ادب سے دونوں نے جھک کر فراشی سلام کیا، وہ سمجھے کوئی راہ گیر ہیں۔ میری وجاہت کی وجہ سے سلام کر رہے ہیں۔ یہ نہ سمجھے کہ سائل ہیں، ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے، وہ تو سلام لیتے ہوئے آگے بڑھے اور ہم نے وہی پہلے والی ترکیب کی کہ چکر کھا کر پھر سامنے آ گئے۔ یہ دیکھ کر وہ ذرا ٹھٹکے۔ پوچھا۔ "میں نے آپ صاحبوں کو نہیں پہچانا، کیا مجھ سے کوئی کام ہے؟" ہم رام کہانی بیان کر کے عرض مدعا زبان پر لائے، فرمانے لگے۔ "تم کو معلوم ہے کہ میں پنجاب یونیورسٹی کا ممتحن ہوں" بجنسہ اُسی لہجے میں یہ الفاظ ادا کیے جیسے اس زمانہ میں کوئی کہے "تم کو معلوم ہے کہ میں سی۔ آئی۔ ڈی کا انسپکٹر ہوں" لیکن ہم جان سے ہاتھ دھوئے بیٹھے تھے، عرض کیا کہ "ہم امتحان میں رعایت کے طالب نہیں، تعلیم میں مدد چاہتے ہیں"، فرمانے لگے "تم کو تعلیم دینا اور پھر ممتحن رہنا میرے ایمان کے خلاف ہے، کسی دوسرے کی تلاش کیجیے" ممکن ہے کہ یہ مسئلہ کوئی جزو ایمان ہو، ممکن ہے کہ پنجاب یونیورسٹی نے مولوی صاحب سے تعلیم نہ دینے کا حلف لے لیا ہو۔ بہر حال کچھ بھی ہو، اُنھوں نے ہم دونوں کو سلام علیکم کا ایک زور سے دھکا دے کر نوکر کو حکم دیا کہ آگے بڑھو، وہ حکم کا بندہ قندیل اُٹھا آگے چلا، اور مولوی صاحب اس کے پیچھے پیچھے لمبے لمبے ڈگ بھرتے روانہ ہوئے، ڈر تھا کہ کہیں یہ دونوں قطاع الطریق پھر راستہ نہ روک لیں، مگر مولوی صاحب کے طرز عمل اور سلام علیکم کے جھٹکے نے ہم دونوں کو مضمحل کر دیا تھا۔ جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے کے

کھڑے رہ گئے، اور مولوی صاحب رھٹ کے کنویں کی گلی میں گھس اپنے مکان میں داخل ہوگئے، چلو اُمید نمبر۲ پر پانی پھر گیا، لیکن آئندہ کے لیے سبق مل گیا کہ ایسے زبردست دشمن پر کُھلے میدان میں حملہ کرنا خطرناک ہے، ایسے رُستم کو پکڑنے کے لیے شغاد بننا ضرور ہے، وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر کونسل ہوئی اور رزولیوشن پاس ہوا کہ مولوی نذیر احمد صاحب پر حملہ عبدالرحمٰن کی آڑ میں کیا جائے۔

اب میاں عبدالرحمٰن صاحب کا حال بھی سُن لیجیے، اُن کے والد کا نام سراج الدین صاحب تھا، نہایت نیک اور پرہیز گار شخص تھے، جوتوں کی دوکان تھی، مولوی نذیر احمد صاحب اِس دوکان کو ہمیشہ رقمی مدد دیا کرتے تھے، اور روزانہ شام کو وہاں آکر بیٹھتے تھے۔ عبدالرحمٰن[1] میرے ہمجاعت تو نہ تھے لیکن آپس میں میل جول بہت تھا، مولوی صاحب کو اُن کی تعلیم کا بہت خیال تھا، چنانچہ انھی کی وجہ سے عبدالرحمٰن نے بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی کے امتحانات پاس کیے انھی کی وجہ سے وکالت میں ترقی کی، یہاں تک کہ مولوی صاحب ہی کی دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ اس وقت دہلی میں اُن کی ٹکر کا کوئی مسلمان وکیل نہیں ہے، اُس زمانہ میں یہ ایف۔اے میں پڑھتے تھے۔

بہرحال اسکیم تیار ہوگئی، اور دوسرے ہی دن سے میں نے عبدالرحمٰن کو گانٹھنا شروع کیا۔ دو ایک روز کے بعد اُن سے اظہار مطلب کیا، کہنے لگے کہ "بھئی مولوی صاحب کو فرصت کم ہے کہیں

---

[1] یہ اب لاہور ہائیکورٹ کے جج ہیں۔

جوتوں کی بر داشت کرتا تھا، جرابوں سے انھیں ہمیشہ نفرت تھی، گو دربار میں جانے کے لیے دو ایک جوڑیاں پاس رہتی تھیں۔ یہ تو پبلک کے مولوی صاحب ہوئے۔

اب ہمارے مولوی صاحب کو دیکھیے، آئیے میرے ساتھ چوڑی والوں سے چلیے۔ چوڑی والوں سے نکل کر چاوڑی میں آئے۔ اُلٹے ہاتھ کو مڑ کر قاضی کے حوض پر سے ہوتے ہوئے سرکی والوں سے گزر کر لال کنویں پہنچے۔ آگے بڑھے تو بڑیوں کا کٹڑہ ہے۔ وہاں سے آگے چل کر نئے بانس میں آئیے، یہ سیدھا راستہ کھاری باولی کو نکل گیا ہے۔ نکڑ سے ذرا ادھر ہی دائیں ہاتھ کو ایک گلی مڑی ہے، یہ بتاشے والوں کی گلی ہے، بتاشے بنتے ہوئے ہم نے سب سے پہلے یہیں دیکھے، یہاں اچار چٹنیوں والوں کی بیسیوں دوکانیں ہیں، انہی دوکانوں کے بیچ میں سے ایک گلی سیدھے ہاتھ کو مڑی ہے، تھوڑی ہی دُور جا کر بائیں طرف ایک پتلی سی گلی اُس میں سے کٹ گئی ہے، اس گلی میں پہلا ہی مکان مولوی صاحب کا ہے۔ مکان دومنزلہ ہے اور نیا بنا ہوا ہے، صفائی کی یہ حالت ہے کہ تنکا پڑا نظر نہیں آتا، دروازے کے باہر دونوں پہلوؤں میں دو سنگین چوکیاں ہیں، دروازے کو عبور کرنے کے بعد صحن میں آتے ہیں، صحن کسی قدر چھوٹا ہے، سیدھی طرف دفتر ہے جہاں اکثر دو تین آدمی بیٹھے کلام مجید پڑھا کیا کرتے ہیں، اس کے مقابل۔ بائیں طرف باورچی خانہ ہے۔ چولھے بنے ہوئے ہیں، آگ جل رہی ہے، مگر برتن اور ہنڈیاں وغیرہ جو باورچی خانہ کا جزو لاینفک ہیں

سرے سے ندارد ہیں، آگ صرف حقہ کے لیے سلگائی جاتی ہے۔ کھانا دوسرے گھر سے پک کر آتا ہے، دروازے کے بالکل سامنے اکہرا دالان ہے، اور اندر ایک لمبا کمرہ، گرمی کا موسم ہے اور مولوی صاحب ایک چھوٹی سی میز کے سامنے بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں، کمرے کے دو دروازے بند ہیں، ایک کھلا ہے، باہر ایک بڑھیا پھونس چماری بیٹھی پنکھے کی رسّی کھینچ رہی ہے ہاں میں کیا تصویر دکھانا چاہتا تھا؟ مولوی صاحب کا لباس، مگر خدا کے فضل سے اُن کے جسم پر کوئی لباس ہی نہیں ہے جس کا تذکرہ کیا جائے۔ نہ کرتہ ہے نہ ٹوپی نہ پیجامہ، ایک چھوٹی سی تہمد برائے نام کمر سے بندھی ہوئی ہے، بندھی ہوئی نہیں، محض لپٹی ہوئی ہے، لیکن گرہ کے جنجال سے بے نیاز ہے، کمرے میں نہایت اُجلی چاندنی کا فرش ہے۔ ایک طرف پلنگ بچھا ہوا ہے کبھی اس پر چادر ہے کبھی نہیں ہے، سرہانے تکیہ رکھا ہے۔ مگر اس کی رنگت کا بیان احاطۂ تحریر سے باہر ہے، البتہ جس گاؤتکیہ سے مولوی صاحب لگے بیٹھے ہیں وہ بہت صاف ہے۔ قالین بھی عمدہ اور قیمتی ہے، اگر مولوی صاحب کی حالت دیکھ کر آپ سوال کر بیٹھیں کہ "مولانا ایں چہ کار ست کہ کردہ" تو انشاء اللہ یہی جواب ملے گا کہ "محتسب را درونِ خانہ چہ کار" جاڑوں میں مکان کے اُوپر کے حصّہ میں رہتے تھے، چلیے وہاں کا رنگ بھی دکھا دوں، صدر دروازے سے ملا ہوا زینہ ہے اور سیڑھیوں کے ختم ہونے پر غسل خانہ اور بیت الخلا ہے" اس کے بعد ایک دروازہ آتا ہے، دروازے سے گذر کے چھت پر آتے ہیں۔ سامنے ہی ایک

کمرہ ہے، اوراس کے دونوں جانب کوٹھریاں، غسل خانے کے بالکل مقابل، دوسری طرف ایک چھوٹا سا کمرہ ہے، آخر آخر میں مولوی صاحب یہیں رہا کرتے تھے، جس زمانہ میں ہم پڑھتے تھے تو ان کی نشست سامنے والے بڑے کمرے میں تھی، یہاں بھی چاندنی کا فرش ہے اس پر قالین، پیچھے گاؤتکیہ، سامنے ایک چھوٹی نیچی میز، پہلو میں حقہ، اس کی حقیقت کما حقہٗ بیان کرنا مشکل ہے، مولوی صاحب کو حقہ کا بہت شوق تھا مگر تمباکو ایسا کڑوا پیتے تھے کہ اُس کے دھوئیں کی کڑواہٹ بیٹھنے والوں کے حلق میں پھندا ڈال دیتی تھی، فرشی قیمتی تھی مگر چلم پیسہ کی دو والی، اور نیچہ تو خدا کی پناہ، اس کے تیار ہونے کی تاریخ لوگوں کے دلوں سے مدت کی محو ہو چکی تھی، ایک آدھ دفعہ ایک صاحب نے نیچہ بدلنے کا ارادہ بھی کیا مگر مولوی صاحب نے نیچے کو جورو کا مترادف قرار دے کر ایسا سخت فقرہ کسا کہ بیچارے ٹھنڈے ہو کر رہ گئے۔ خیر جاڑے کا موسم ہے مولوی صاحب بیٹھے حقہ پی رہے ہیں اور پڑھا رہے ہیں، سر پر کنٹوپ ہے۔ مگر بڑا دقیانوسی، کبھی کانوں کو ڈھکے ہوئے اور ڈوریاں نیچے لٹکتی ہوئیں کبھی اس کے دونوں پاکھے اُوپر کی طرف سیدھے کھڑے ہو کر لاٹ پادری کی ٹوپی کا نمونہ بن جاتے اور ڈوریاں طرّے کا کام دیتیں، کبھی پاکھوں کو سر پر اوپر تلے ڈوریوں سے کس دیا جاتا اور اس طرح کنٹوپ فلٹ کیپ کی شکل اختیار کر لیتا، جسم پر روئی کی مرزئی مگر ایسی پُرانی کہ اس کی روئی کی گرمی مدت سے مائل بہ سردی ہو چکی ہے، اُوپر صندلی رنگ کا

دُھسہ پڑا ہوا، لیجیے دیکھا آپ نے ہمارے مولوی صاحب کو؟
چار بجے اور مولوی صاحب نے آواز دی "پانی تیار ہے؟ جواب
ملا "جی ہاں" مولوی صاحب غسل خانہ میں گئے، کپڑے بدل
(یا یوں کہو کہ جون بدل) باہر نکل آئے اور چلے ٹاؤن ہال کو،
لیجیے۔ اب یہ ہمارے مولوی صاحب نہیں رہے، آپ کے مولوی صاحب ہوگئے۔
گھر میں اس لباس سے استغناء کے کئی باعث تھے، اول تو
یہ بات تھی کہ اُن کو اپنے کاموں ہی سے فرصت نہ تھی، پڑھنے پڑھانے
اور لکھنے لکھانے میں ان کا سارا دن گذر جاتا تھا، دوسرے یہ کہ
وہ بہت کم لوگوں سے مکان پر ملتے تھے جس کو ملنا ہوتا تھا شام کو
ٹاؤن ہال کی لائبریری میں جاکر اُن سے مل آتا تھا، جو لوگ مکان
پر آتے تھے وہ یا تو اُن کے شاگرد ہوتے تھے یا خود صاحب کمال،
اور ظاہر ہے کہ ایسے صاحب کمال لوگ ظاہری حالت کو نہیں
دیکھتے، یہ دیکھتے ہیں کہ مولوی صاحب ہیں کتنے پانی میں۔ لباس سے
اس بے اعتنائی کی تیسری وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے گھر کو اپنا گھر سمجھتے
تھے، کسی دوسرے کا دولت خانہ نہیں جانتے تھے، اُن کو جس طرح
آرام ملتا اُسی طرح رہتے، جی چاہا پہنتے، نہ جی چاہتا نہ پہنتے، البتہ
جب باہر جاتے تو "کھائے من بھاتا پہنے جگ بھاتا" پر عمل کرتے۔
اصل عالم تو گھر پر تھے، باہر نکل کر ظاہری عالم بھی بن جاتے۔
سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ گھر میں کوئی عورت نہ تھی جو ایسی چھوٹی
چھوٹی باتوں کا خیال رکھتی، یا کم سے کم اُن کا کنٹوپ، مرزئی یا سرہانے
کے تکیے کا غلاف تو بدل دیا کرتی؛ گھر میں تھا کون، ایک مولوی صاحب،

دوسرا ایک کانڑا ٹٹو بڈھو نفر، ان کا نوکر خدا بخش، وہ ایسا بے پرواکہ خدا کی پناہ، ظالم نے بہرا بن کر کام سے اور اپنا پیچھا چھڑا لیا تھا، مولوی صاحب کی آواز جس سے مردے قبر میں چونک پڑیں اس کو کبھی نہ سُنائی دی، اور جب تک کسی نے جا کر اس کا شانہ نہ ہلایا اُس نے ہمیشہ سنی کو اَن سُنی کر دیا۔ البتہ حقے کے معاملے میں بڑا تیز تھا، یا تو اُس کو یہ خیال تھا کہ حقے بغیر مولوی صاحب کے ہاں گزارہ ہونا مشکل ہے یا یہ وجہ تھی کہ تمباکو زیادہ صرف کرنے میں اس کو دو ایک پیسے روز مل جاتے تھے، غرض یہ حال تھا کہ حقہ پورا سلگا بھی نہیں کہ وہ چلم اٹھا کر چلا۔ مولوی صاحب ہاں۔ ہاں کرتے ہی رہے اُس نے جا، چلم اُلٹ دی، دوسرا سُلفہ رکھ، آگ بھر، چلم حقہ پر لا کر رکھ دی، تو اگرم، حقہ بھڑک گیا۔ میاں نوکر صاحب کو پھر بلا کر توا ٹھنڈا کرنے اور چلم بھروانے کی ضرورت پیش آئی۔ غرض سارے دن اُن کا یہی کام تھا اور وہ اس میں بہت خوش اور مگن تھے۔

جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ وقت کا اس قدر پابند تھا کہ لوگ اُس کو دیکھ کر اپنی گھڑیاں ٹھیک کر لیتے تھے، بعض یورپ پرست اس کی پابندی اوقات کو یورپ والوں کا ہی حصہ خیال کریں تو خیال کریں میں تو کہتا ہوں کہ میں نے صرف دہلی میں تین شخص ایسے دیکھے ہیں جو آندھی آئے مینہ ائے، روزانہ چھ بجے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں آتے تھے، ادھر انھوں نے لائبریری کے دروازے میں قدم رکھا اور اُدھر گھنٹہ گھر نے ٹن ٹن چھ بجائے، لطف یہ ہے کہ اُن میں سے ایک مشرق میں رہتا تھا تو دوسرا مغرب میں،

یہ تین شخص کون تھے؟ ایک منشی ذکاء اللہ صاحب، دوسرے رائے بہادر پیارے لال صاحب، اور تیسرے مولوی صاحب، ایک چیلوں کے کوچہ سے آتا تھا، دوسرا دریبہ سے اور تیسرا کھاری باؤلی سے، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک نے آکر دوسرے کا انتظار کیا ہو، اگر ان میں سے کوئی نہ آتا تھا تو ایک ہی نتیجہ نکل سکتا تھا کہ نہ آنے والا ایسا بیمار ہے کہ چلنا دشوار ہے۔ اور یہ نتیجہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوا میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سُنا ہے کہ اگر کسی شخص کو ان تینوں میں سے کسی سے ملنا ہوتا اور چھ بجے سے ذرا پہلے وہ لائبریری کے کسی ملازم سے جاکر دریافت کرتا تو یہی جواب ملتا کہ وہ اب آتے ہی ہونگے چھ میں دو ہی منٹ تو رہ گئے ہیں۔" دوسرے دو صاحبوں کا ٹائم ٹیبل تو مجھے معلوم نہیں، البتہ مولوی صاحب کی مصروفیتوں کا حال لکھتا ہوں، ان کے اس نظام اوقات میں گرمی اور جاڑے کے لحاظ سے کچھ کچھ تغیر ہو جاتا تھا، وہ ہمیشہ بہت سویرے اٹھنے کے عادی تھے۔ گرمیوں میں اٹھتے ہی نہاتے اور ضروریات سے فارغ ہوکر نماز پڑھتے، ان کی صبح کی اور عصر کی نماز کبھی ناغہ نہ ہوتی تھی، باقی کا حال اللہ کو معلوم ہے، نہ میں نے دریافت کیا اور نہ مجھ سے کسی نے کہا، صبح کی نماز پڑھ کر کچھ تلاوت کرتے، اِدھر ذرا دن چڑھا اُدھر مولویوں کی جماعت اور خود مولوی صاحب کا ناشتہ داخل ہوا، اس جماعت میں بخارا، کابل سرحد وغیرہ کے لوگ تھے، ان کی تعداد کوئی ۱۵، ۱۶ تھی، محنت ایسی کرتے تھے کہ کوئی دوسرا کرے تو مرجائے۔ لیکن ٹھوٹھ ایسے تھے کہ مولوی صاحب بھی اُن سے زچ ہو جاتے تھے،

خوش مذاقی تو انھیں چھو کر نہیں گئی تھی، خود مذاق کرنا تو کجا دوسرے کا مذاق بھی نہیں سمجھ سکتے تھے، متانت اور ادب کا یہ حال تھا کہ آنکھ اُٹھا کر مولوی صاحب کو دیکھنا سوء ادبی سمجھتے تھے، اب اُن کے "وہ عمامے اونچے اونچے یہ یہ لمبی داڑھیاں" دیکھو اور مولوی صاحب کی حالت کا اندازہ کرو، بیچارے ناشتہ کرتے جاتے اور اپنا فرض اُتارتے جاتے تھے۔ عالم تھے دوسروں کو عالم بناتے تھے، لیکن کہا کرتے تھے کہ "اِن فتحپوری کے ملّانوں کو پڑھا کر میرا دل بیٹھ جاتا ہے، کیا کہوں، میں ہوں ہنسوڑا تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں، کا نقشہ ہے۔" یہ جماعت اٹھی اور مولوی رحیم بخش صاحب آنازل ہوئے، کاغذوں کا مٹھا بغل میں، ہاتھ میں پنسل، کان میں قلم، اُدھر فتحپور کی جماعت نے کمرہ سے قدم نکالا اِدھر اُنھوں نے کمرہ میں قدم رکھا، اب سلسلۂ تصنیف و تالیف شروع ہوا۔ چونکہ آخر آخر میں مولوی صاحب کے ہاتھ میں رعشہ آگیا تھا۔ اس لیے لکھوانے کا کام اکثر انھیں سے لیا جاتا تھا، سب سے پہلے کلام مجید اور حمائل شریف کی صحت کی جاتی اس کے بعد مطبع کا حساب دیکھا جاتا اور پھر جدید تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوتا، یہ کام سمیٹتے سمیٹتے ساڑھے گیارہ پونے بارہ بج جاتے، رحیم بخش صاحب کے اٹھتے ہی کھانا آتا۔ کھانا کھایا اور پلنگ پر لیٹ گئے۔ اِدھر ڈیڑھ بجا اور اُدھر ہم دونوں داخل ہوئے، ہمارا قدم رکھنا تھا کہ مولوی صاحب اُٹھ بیٹھے، ساڑھے تین بجے تک ہم سے سر مغزی کرتے رہے، اگر کوئی دلچسپ بحث یا قصہ چھڑ گیا تو چار بج گئے۔ چار بجے اور مولوی صاحب غسل خانے میں گئے، نہائے دھوئے کپڑے پہن کر نکل کھڑے ہوئے،

پہلے شمس العارفین کی دوکان پر ٹھیرے، یہاں بھی اُن کا حساب کتاب تھا، وہاں کا کھاتہ دیکھا، جو کچھ لینا دینا تھا لیا دیا اور سیدھے ٹاون ہال کی لائبریری میں پہنچ گئے، سات بجے تک وہاں ٹھیرے جس کو ملنا ہوا وہاں مل لیا، سات بجے وہاں سے اُٹھ کر سراج الدین صاحب کی دوکان پر آئے، یہاں بھی حساب کیا۔ عبدالرحمٰن کو پڑھایا، گھنٹہ بھر یہاں ٹھہر کر مکان پہنچ گئے۔ کھانا کھایا۔ کچھ لکھا پڑھا اور دس بجے سو رہے جاڑے میں پروگرام میں یہ تبدیلی ہوجاتی تھی کہ پہلے صبح ہی صبح ہم پہنچتے تھے، اُس کے بعد مولویوں کی جماعت آتی تھی، رحیم بخش صاحب کا نمبر سہ پہر میں آتا تھا۔

خوش خوراک تھے اور مزے لے لے کر کھانا کھاتے تھے، ناشتے میں دو نیم برشت انڈے ضرور ہوتے تھے، میوہ کا بڑا شوق تھا، ناشتہ اور کھانے کے ساتھ میوہ کا ہونا لازم تھا، پڑھانے جاتے تھے اور کھاتے جاتے تھے۔ مگر مجھ کو یہ حسرت رہ گئی کہ کبھی شریک طعام نہ ہوسکا، خیر ان پٹھانوں کی جماعت کی تو کیا صلا کرتے اُن کے لیے تو مولوی صاحب کا ناشتہ اونٹ کے ڈاڑھ میں زیرہ ہوجاتا، البتہ ہم دونوں کی صلا نہ کرنا غضب تھا، کہتے بھی جاتے تھے۔ بھئی کیا مزے کا خربوزہ ہے۔ میاں کیا مزہ کا آم ہے" مگر بندۂ خدا نے کبھی یہ نہ کہا کہ بیٹا ذرا چکھ کر تو دیکھو یہ کیسا ہے میں نے تو تہیہ کرلیا تھا (میاں دانی اب انکار کریں تو کریں لیکن ان کا بھی یہی ارادہ تھا) کہ مولوی صاحب اگر جھوٹے مُنہ بھی شریک ہوتے کو کہیں تو ہم سچ مچ شریک ہوجائیں۔

مولوی صاحب کو مسلمانوں میں تجارت پھیلانے کا شوق تھا اور اس غرض کے حاصل کرنے میں اُن کو مالی مدد دینے میں کبھی انکار نہ ہوتا تھا، بے دریغ روپیہ دیتے تھے اور اکثر بڑی بڑی رقمیں ڈبو بیٹھتے تھے، کہا کرتے تھے "میاں میں سچ کہتا ہوں کہ اس تجارت کے شوق میں تین لاکھ روپئے کھو بیٹھا ہوں، پھر بھی جو کچھ مجھے بعض کھرے دوکانداروں سے فائدہ پہنچا ہے اس نے میرے نقصان کی تلافی ہی نہیں کر دی بلکہ کچھ نفع ہی پہنچا دیا ہے، بیٹا تم بھی تجارت کرو، روپیہ میں دیتا ہوں، نوکری کی کھکیڑ اٹھاؤ گے تو مزا معلوم ہوگا" جس طرح روپیہ دل کھول کر دیتے تھے اُسی طرح حساب بھی بڑی سختی سے لیتے تھے۔ گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا مینھ، قرض داروں کے ہاں اُن کا روزانہ چکر نہ چھوٹتا تھا، گئے اور جاتے ہی پہلے "غلق" پر قبضہ کیا اس کے بعد کھاتہ دیکھا، کردی دیکھی، سامان دیکھ کر بکری کا اندازہ کیا۔ روپیہ جیب میں ڈالا، سلام علیکم وعلیکم السلام کیا اور چل دیئے دوسرے دوکاندار کے پاس پہنچے اور وہاں بھی وہی پہلا سبق دُھرایا، کوڑی کوڑی کا حساب دیکھتے، اعتراضوں کی بوچھار سے پریشان کرتے اور کہتے جاتے "بھئی حساب جو جو بخشش سو سو" فقرے کے پہلے جزو سے تو بیچاروں کو روزانہ واسطہ پڑتا۔ لیکن دوسرے جزو کا دیکھنا کبھی کسی کو نصیب نہ ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ اگر واقعی بازار کے مندا ہونے یا کسی اور وجہ سے اُن کے کسی قرض دار کا نقصان ہوتا یا دیوالہ نکل جاتا تو پھر اُس قرضے کا ذکر زبان پر نہ لاتے، اُن کو خیال تھا کہ دہلی کے پنجابی، تجارت کو خوب سمجھتے ہیں، اُن کو دل

کھول کر روپیہ دیتے تھے، اور اکثر اُن ہی کے ہاتھوں نقصان اُٹھاتے تھے، مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں، ایک صاحب جن کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں مولوی صاحب کے پاس آئے۔ تجارت کا ذکر چھیڑا، اور مولوی صاحب کو ولایتی جوتوں کے فائدے کے وہ سبز باغ دکھائے کہ تیسرے ہی روز بلا کسی طمانیت کے گیارہ ہزار روپے کا چیک مولوی صاحب نے ان کے نام لکھ دیا، بڑے ٹھاٹھ سے سنہری مسجد کے قریب دوکان کھولی گئی، مولوی صاحب جاتے، گھڑی دو گھڑی وہاں بیٹھتے، دوکان دار صاحب کی چکنی چپڑی باتیں سنتے، چلتے وقت کچھ روپے جیب میں ڈالنے کو مل جاتے۔ اس لیے خوش خوش بغیر حساب کیے گھر آجاتے، یہی ٹھوکر تھی جس نے مولوی صاحب کو چوکنا کر دیا تھا اور وہ بغیر حساب کتاب دیکھے روپے کو ہاتھ لگانا گناہ سمجھتے تھے، قصہ مختصر، اصل میں دو ڈھائی ہزار روپیہ مولوی صاحب کو تھما اُس نے دیوالہ نکال دیا۔ قرقی ہوئی، مال نیلام چڑھا اور اس میرے یار نے کل سامان دوسروں کے ذریعہ سے خود خرید لیا، مولوی صاحب کو اس چال کی کانوں کان خبر نہ ہوئی، اس کے بعد آیا، بہت رویا، بہت ٹسوے بہائے۔ مولوی صاحب سمجھے بیچارے کو بڑا رنج ہوا۔ کہا دو بھئی جاؤ تجارت میں یہی ہوتا ہے، یا اِس پار یا اُس پار" چلو گئی گذری بات ہوئی، ایک روز خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ یہ چاوڑی میں جا رہے تھے، کچھ جھٹپٹا ہوا تھا، کیا دیکھتے ہیں کہ دوکاندار صاحب خوب بنے ہوئے، عطر میں بسے، پھولوں کا کنٹھا گلے میں ڈالے، ایک رنڈی کا ہاتھ پکڑے، کوٹھے سے اُترے اور

میری طرف دیکھا اور کہا "کیوں آپ کو اس پر کوئی اعتراض ہے"
میں نے عرض کی "جی نہیں، لیکن اس قطعہ کو سُن کر مجھے دبیر کی ایک
رباعی یاد آگئی، فرماتے ہیں ؎

ہم شانِ نجف نہ عرشِ انور ٹھیرا — میزاں میں یہ بھاری وہ سُبکتر ٹھیرا
اس پلّے میں تھا نجف اور اس پلّے میں عرش — پہنچا وہ فلک پر یہ زمیں پر ٹھیرا

بڑے غور سے سنتے رہے، پھر کہنے لگے "یہ تو بے معنی ہے،
نجف کی جگہ دنیا کی جس چیز کو رکھ دو اُس سے یہ رُباعی متعلق ہو جائیگی
اور وہ عرش سے بھاری ثابت ہو گی" میں نے عرض کی کہ آپ
کے قطعہ کو اس سال میں مرنے والی جس عورت سے متعلق کردو متعلق
ہو جائے گا، اس تاریخ میں خوبی ہی کیا ہے۔ اول تو ایسی عام تاریخیں
کچھ قابلِ تعریف نہیں ہوتیں دوسرے سرسیّد کی تاریخ انتقال
"غفرلہ" پر آپ نے صرف الف کا اضافہ کر کے اس کو اپنا مال کر لیا
ہے۔" مسکرا کر کہنے لگے "اچھا بھئی تو ہی سچّا سہی، خیر اب اس
جھگڑے کو چھوڑو اور میری اصل کہانی کو لو، ہاں تو فرصت کے وقت
ہم دہلی کی گلیوں کا چکّر لگاتے، کبھی کبھی کشمیری دروازہ کی طرف بھی
نکل جاتے۔ ایک روز جو کشمیری دروازہ کی طرف گیا تو کیا دیکھتا
ہوں کہ دہلی کالج میں بڑا ہجوم ہے، کالج وہاں تھا جہاں اب گورنمنٹ
اسکول ہے، میں بھی بھیڑ میں گھس گیا۔ معلوم ہوا کہ لڑکوں کا امتحان
لینے مفتی صدرالدین صاحب آئے ہیں، ہم نے کہا چلو ہم بھی دیکھیں،
برآمدے میں پہنچا، قد چھوٹا تھا لوگوں کی ٹانگوں میں سے ہوتا ہوا
گھس گھسا کر کمرے کے دروازہ تک پہنچ ہی گیا، دیکھا کہ کمرے کے

بیچ میں میز بچھی ہے۔ اُس کے سامنے کرسی پر مفتی صاحب بیٹھے ہیں۔ ایک ایک لڑکا آتا ہے اُس سے سوال کرتے ہیں اور سامنے کاغذ پر کچھ لکھتے جاتے ہیں۔ میز کے دوسرے پہلو کی کرسی پر ایک انگریز بیٹھا ہے۔ یہ مدرسے کے پرنسپل صاحب تھے۔ ہم تماشے میں محو تھے کہ صاحب کسی کام کے لیے اٹھے۔ چپراسیوں نے راستہ صاف کرنا شروع کیا۔ جو لوگ دروازہ روکے کھڑے تھے وہ کسی طرح پیچھے ہٹتے ہی نہیں تھے۔ چپراسی زبردستی ڈھکیل رہے تھے۔ غرض اس دھکا پیل میں میرا قلیہ ہو گیا۔ دروازے کے سامنے سنگ مرمر کا فرش تھا۔ اُس پر سے میرا پاؤں رپٹا اور میں دھم سے گرا، اتنی دیر میں پرنسپل صاحب بھی دروازے تک آ گئے تھے۔ انھوں نے جو مجھے گرتے دیکھا تو دوڑ کر میری طرف بڑھے مجھے اُٹھایا۔ پوچھتے رہے کہ کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔ ان کی شفقت آمیز باتیں اب تک میرے دل پر کالنقش فی الحجر ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں پوچھا "میاں صاحبزادے کیا پڑھتے ہو"؟ میں نے کہا "معلقات" ان کو بڑا تعجب ہوا۔ پھر پوچھا۔ میں نے پھر وہی جواب دیا۔ میری عمر پوچھی۔ میں نے کہا "مجھے کیا معلوم" وہ میرا ہاتھ پکڑ بجائے اپنے کام کو جانے کے سیدھا مجھ کو مفتی صاحب کے پاس لے گئے، اور کہنے لگے "مفتی صاحب یہ لڑکا کہتا ہے میں معلقات پڑھتا ہوں۔ ذرا دیکھیے تو سہی سچ کہتا ہے یا یونہی باتیں بناتا ہے۔" مفتی صاحب نے کہا "تو کیا پڑھتا ہے" میں نے کہا "معلقات" کہنے لگے کہاں پڑھتا ہے"؟ میں نے کہا "پنجابیوں کے کٹڑے کی مسجد میں"

پھر کہا "معلقات دوں۔ پڑھیگا" میں نے کہا "لائیے" انھوں نے میز پر سے کتاب اُٹھائی میرے ہاتھ میں دی۔ اور کہا "یہاں سے پڑھ" جس شعر پر انھوں نے انگلی رکھی تھی، وہ یہی شعر تھا ؎

ابا ہند فلا تعجل علینا وانظرنا نخبرک علینا

میں نے پڑھا۔ معنی بیان کیے۔ اُنھوں نے ترکیب پوچھی وہ بیان کی، میاں دائی تمھاری طرح میں نے شعر نہیں پڑھا تھا اور میاں فرحت تمھاری طرح ترکیب نہیں کی تھی (مولوی صاحب کا یہ اشارہ ہماری کمزوریوں کی طرف تھا اس کا ذکر آئندہ آئے گا) مفتی صاحب بہت چکرائے، پوچھنے لگے "تجھ کو کون پڑھاتا ہے" میں نے کہا "مسجد کے مولوی صاحب" کہا "مدرسے میں پڑھے گا" میں نے جواب دیا "ضرور پڑھونگا" مفتی صاحب نے قلم اٹھا کاغذ پر چند سطریں لکھیں اور پرنسپل صاحب کو دے کر کہا "اس کو پریسیڈنٹ صاحب کے پاس پیش کردینا" ہم وہاں سے نکل اپنے گھر آئے۔ مولوی صاحب سے کچھ نہ کہا۔ کوئی سات آٹھ روز کے بعد کالج کا چپراسی مولوی صاحب کے پاس ایک کاغذ دے گیا۔ اُس میں لکھا تھا کہ نذیر احمد کو کالج میں داخل کرنے کی اجازت ہوگئی ہے۔ کل سے آپ اُس کو کالج میں آنے کی ہدایت کردیجیے۔ اس کا وظیفہ بھی ہوگیا ہے۔ چپراسی تو یہ حکم دے چلتا بنا۔ مولوی صاحب نے مجھ کو بلایا۔ خط دکھایا۔ پوچھا یہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ جب ذرا سختی کی تو تمام واقعہ بیان کیا وہ بہت خوش ہوئے۔ اور دوسرے روز لے جا میرا ہاتھ پرنسپل صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس زمانے میں سید احمد خاں فارسی کی جماعت

میں، منشی ذکاءاللہ حساب کی جماعت میں اور پیارے لال انگریزی کی جماعت میں پڑھتے تھے۔ میں عربی کی جماعت میں شریک ہوا۔ ایک توشوق، دوسرے پڑھانے والے ہشیار، تیسرے ایک مضمون اور وہ بھی ایسا جس کا مجھے بچپن سے شوق تھا، تھوڑے ہی دنوں میں اپنی سب جماعت والوں کو دبالیا۔ اب جب کبھی یہ شعر پڑھتا ہوں تو پہلا زمانہ یاد آجاتا ہے اور میں بے اختیار ہنسنے لگتا ہوں۔ یہ کہتے ہی انھوں نے لہک لہک کر یہ شعر ؎

اباہند فلا تعجل علینا ۔۔۔ وانظرنا نخبرک الیقینا

پڑھنا اور ہنسنا شروع کیا۔

میں نے کہا مولوی صاحب آپ کی جماعت کہاں بیٹھی تھی۔ کہنے لگے "پرنسپل صاحب کے کمرے کے بازو میں جو چھوٹا کمرہ ہے اُس میں ہماری جماعت تھی۔ دوسرے پہلو میں جو کمرہ ہے اُس میں فارسی کی جماعت" دانی نے کہا "مولوی صاحب آپ کے اختیاری مضمون کیا تھے" مولوی صاحب ہنسے اور کہا "میاں دانی! ہم پڑھتے تھے آج کل کے طالب علموں کی طرح جوتڑوں سے گھاس نہیں کاٹتے تھے (مولوی صاحب اس فقرہ کا اکثر استعمال کیا کرتے تھے معلوم نہیں کہاں کا محاورہ ہے) ارے بھئی ایک ہی مضمون کی تکمیل کرنا دشوار ہے، آج کل پڑھاتے نہیں لادتے ہیں، آج پڑھا کل بھولے۔ تمھاری تعلیم ایسی دیوار ہے جس میں گارے کا بھی ردّا ہے، ٹھیکریاں بھی گھسیڑ دی گئی ہیں۔ مٹی بھی ہے، پتھر بھی ہے، کہیں چونہ اور اینٹ بھی ہے۔ ایک دھکا دیا اور اڑاڑا دھم گری۔

ہم کو اُس زمانے میں ایک مضمون پڑھاتے تھے مگر اس میں کامل کر دیتے تھے۔ پڑھانے والے بھی ایرے غیرے بچکلیاں نہیں ہوتے تھے، ایسے ایسے کو چھانٹا جاتا تھا جن کے سامنے آج کل کے عالم محض کاٹھ کے اُلو ہیں۔ اچھا بھئی اچھا آگے چلو،

بانا نورد ث الرایات بیضا ونصدرھن حمراً قد روینا

میں نے کہا مولوی صاحب پہلے شعر کے معنی تو رہ گئے۔ کہنے لگے "اتنا بڑا قصّہ سُنا دیا اس کے بعد بھی اس شعر کے معنوں کی ضرورت ہے۔ بس اس کے یہی معنی ہیں کہ تحقیق ایک مُلّا کا بیٹا ڈاکٹر، ڈپٹی شمس العلماء، پی ایچ ڈی ہو گیا۔ ساتھ آسانی کے، بیچ اسی دلّی کے، بوجہ اس شعر کے۔

مولوی صاحب کی تعلیم کا حال سُن چکے، اب ہماری تعلیم کا حال سنیے۔ اور قصّہ کو سراج الدین صاحب کی دوکان کے واقعہ کے دوسرے روز سے لیجیے۔

میں اور میاں دانی ساڑھے گیارہ بجے مدرسے سے آئے کھانا دانا کھایا سبق کا مطالعہ کیا اور ایک بجے نکل کھڑے ہوئے۔ مکان کا پتہ پوچھتے پوچھاتے ڈیڑھ بیں پانچ منٹ تھے کہ مولوی صاحب کے دروازے پر جا دھمکے، دروازے کی ایک چوکی پر میں اور دوسری پر میاں دانی ڈٹ گئے۔ سامنے ہی کمرہ تھا۔ بی چماری رسی ہاتھ میں لیے اونگھ رہی تھیں، کبھی کبھی رسّی کو ایک آدھ جھٹکا دے دیتی تھیں، کمرے کے اندر مولوی صاحب تھے۔ لیکن دروازہ بند تھا۔ اس لیے دکھائی نہ دیتے تھے۔ اب یہ خیال ہوا کہ یہ مولوی صاحب ہی کا مکان ہے یا

کسی دوسرے کا، اندر زنانہ تو نہیں ہے غرض اسی شش و پنج میں تھے کہ مولوی صاحب کے کمرے کے گھنٹے نے ٹن سے ڈیڑھ بجایا۔ ہم دونوں اُٹھے اور دبے پاؤں چوروں کی طرح اندر داخل ہوئے۔ گھر میں سناٹا تھا۔ بی چماری نے سر بھی اُٹھا کر نہ دیکھا کہ کون جا رہا تھا، کمرہ کا ایک دروازہ کھلا تھا اس میں گردن ڈال کر جھانکا۔ چونکہ روشنی سے اندھیرے میں آئے تھے اس لیے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اندر سے کسی نے ڈانٹ کر کہا "کون ہے" اس آواز کو پہچان کر ہم تو سنبھل گئے۔ مگر بی چماری اُچھل پڑیں اور بے اختیار اُن کے مُنہ سے گنبد کی آواز کی طرح نکلا "کون ہے" میں نے کہا "میں اور دانی" مولوی صاحب نے کہا "آؤ بیٹا اندر آؤ" مولوی صاحب فوراً پلنگ پر اُٹھ بیٹھے اور تہمد سنبھالتے ہوئے نیچے اُتر آئے، پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ ہم نے کتاب پیش کی، تھوڑی دیر تک اُلٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ اس کے بعد کہا "بھئی ایک کتاب میرے لیے بھی لیتے آنا" ہم نے اپنی ایک کتاب ان کو دے دی اور دوسری سے دونوں نے مل کر کام نکالا۔ کیا پڑھایا اور کس طرح پڑھایا۔ اس کا میں آئندہ ذکر کروں گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب پڑھ کر اُٹھے تو سب کچھ یاد تھا، مگر دماغ پر کسی قسم کا بار نہ تھا، خوشی خوشی گھر آئے۔ چلو اللہ دے اور بندہ لے۔

ہم نے بھی کالج میں مولوی صاحب کی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ یہاں تک کہ یہ آواز ہندو کالج کے طلباء کے کان تک پہنچی۔ وہاں کے ایک طالب علم مسٹر رضا کے دل میں گدگدی اٹھی۔ وہ آئے

ہم سے ملے اور کہا "بھئی میں بھی تمھارے ساتھ چلوں مولوی صاحب انکار تو نہ کریں گے"۔ ہم نے کہا "چلو اور ضرور چلو، مولوی صاحب کا کیا بگڑتا ہے۔ دو کو نہ پڑھایا، تین کو پڑھایا"۔ انھوں نے کہا نہیں پہلے مولوی صاحب سے پوچھ لو"۔ ہم نے کہا "یار چلو بھی، اگر انھوں نے کچھ کہا تو ہمارا ذمّہ" وہ راضی نہ ہوئے اور یہی کہا کہ پہلے پوچھ لو۔ اس عرصہ میں ہماری ہمت مولوی صاحب کے سامنے بہت بڑھ گئی تھی، دوسرے دن جاتے ہی رضا کا ذکر کیا۔ اُنھوں نے کہا "لیتے کیوں نہ آئے"۔ ہم نے کہا "وہ ذرا شرمیلے ہیں، بغیر اجازت آنا نہیں چاہتے"۔ انھوں نے کہا "طالب علم شرمیلا ہوا اور ڈوبا۔ خیر کل ضرور ساتھ لانا، ذرا اُن کا بھی رنگ دیکھ لوں"۔ شام کو واپسی کے وقت جاتے جاتے فراش خانے میں ہم نے رضا کو مولوی صاحب کا اجازت نامہ پہنچا دیا اور کہہ دیا کہ بھئی پورے ڈیڑھ بجے پہنچ جانا ورنہ اندر گھسنا نہ ملے گا۔ دوسرے دن جو ہم پہنچے تو وہ پہلے ہی سے دروازہ پر ڈھئی دیے بیٹھے تھے ٹھیک ڈیڑھ بجے ہم اندر داخل ہوئے، مولوی صاحب ہم کو دیکھتے ہی پلنگ پر اٹھ بیٹھے اور کہا "لاؤ کتاب"۔ ہم نے کتاب طاق پر سے اُتار اُن کے ہاتھ میں دی۔ اور وہ کتاب لیتے لیتے نیچے آ بیٹھے اور کہا "اچھا یہ ہیں میاں رضا"۔ بیچارے رضا نے گردن جھکا کر کہا "جی ہاں"۔ مولوی صاحب نے کہا "اچھا بھئی شروع کرو۔

ہمارے پڑھنے کا یہ طریقہ تھا کہ ایک روز میں پڑھتا تھا، دوسرے روز میاں دانی، اب اس کو ہماری شرارت کہو یا محض

اتفاق، ہم دونوں چپکے بیٹھے رہے۔ جب اس خاموشی نے طول کھینچا تو مولوی صاحب نے کہا "ارے بھئی آج تم پڑھتے کیوں نہیں۔ کیا منہ میں گھنگھنیاں بھر کر آئے ہو۔ اچھا میاں رضا تم ہی شروع کرو"۔ رضا نے صفحہ پوچھا اور پڑھنا شروع کیا۔ اگر اعراب کی غلطیاں مجھ سے کم کیں تو نظم کو نثر، میاں دانی سے زیادہ بنا دیا۔ ایک آدھ شعر تک تو مولوی صاحب چپکے سنتے رہے۔ اس کے بعد کہنے لگے "واہ بھئی واہ ہم کو بھی عجب نمونے کے شاگرد ملے ہیں، میاں رضا اگر ہم تم کو ایک نیک صلاح دیں تو مانو گے"۔ رضا نے نہایت شرمیلی آواز میں گردن جھکا کر کہا "بسر و چشم"۔ مولوی صاحب نے کہا "دیکھو اپنے وعدہ سے پھر نہ جانا"۔ انھوں نے کہا "جی نہیں"۔ مولوی صاحب نے کہا "اچھا تو میری یہ صلاح ہے کہ کل سے تم میرے ہاں نہ آنا"۔ یہ سن کر وہ بیچارے کچھ پژمردہ سے ہو گئے۔ مولوی صاحب نے کہا "بھئی رضا میں یہ نہیں کہتا کہ میرے ہاں آنا ہی چھوڑ دو۔ میں تم کو بھی ضرور پڑھاؤں گا مگر تم دس پندرہ روز شام کے وقت کالی جان کے ہاں تعلیم میں ہو آیا کرو۔ اتنے دنوں کے آنے جانے میں تمھارے کانوں کو نظم اور نثر کا فرق معلوم ہونے لگے گا۔ بھئی مجھ سے تو شعروں کے گلے پر چھری پھیرتے دیکھا نہیں جاتا۔ بیچارے متنبی کو کیا خبر تھی کہ بتاشوں کی گلی میں نذیر احمد کے کمرے میں اُس کے اشعار مولوی رضا صاحب اس طرح حلال کریں گے"۔ بیچارے رضا کے سر پہ گھڑوں پانی پڑ گیا۔ خدا خدا کر کے سبق ختم ہوا اور ہم سب رخصت ہوئے۔ راستہ میں ہم نے اُن کو بہت بنایا۔

دوسرے روز سے وہ ایسے غائب ہوئے کہ پھر شکل نہ دکھائی۔

مسٹر رضا کی حیا کا حال تو سُن چکے، اب ہماری بے حیائی کی داستان سُنیے۔ میری صرف و نحو بہت کمزور تھی اور کمزور کیوں نہ ہوتی، شروع کیے ہوئے کے دن ہوئے تھے۔ اعراب میں ہمیشہ غلطی کرتا تھا۔ نثر کو تو سنبھال لیتا تھا مگر نظم میں دقت پڑتی تھی۔ شعر خود بھی کہتا تھا۔ دوسروں کے ہزاروں اشعار یاد تھے۔ اس لیے شعر کو تقطیع سے گرنے نہ دیتا تھا۔ میاں دانی کی حالت اس کے بالکل برعکس تھی۔ وہ اعراب کی غلطی نہ کرتے تھے مگر شعر کو نثر کر دیتے تھے۔ سکتے تو کیا جھٹکے پڑ جاتے تھے۔ مولوی صاحب ہم دونوں کے پڑھنے سے بہت جز بز ہوتے تھے۔ ایک دن یہ ہوا کہ میرے پڑھنے کی باری تھی۔ میں نے ایک شعر پڑھا۔ معلوم نہیں کہاں کے اعراب کہاں لگا گیا۔ مولوی صاحب نے کہا "ہیں کیا پڑھا" میں سمجھا کہ اعراب میں کہیں غلطی ضرور ہوئی تمام اعراب بدل کر شعر موزوں کر دیا۔ اُنھوں نے پھر بڑے زور سے "ہوں" کی۔ ہم نے پھر اعراب بدل دیے۔ اس سے اُن کو غصّہ آگیا۔ کہا "دانی تم تو پڑھو" انھوں نے شعر کا گلا ہی گھونٹ دیا۔ خاصے بھلے چنگے شعر کو نثر بنا دیا۔ اب کیا تھا۔ مولوی صاحب کا پارہ ایک سو دس ڈگری پر چڑھ گیا۔ کتاب اٹھا کر جو پھینکی تو کمرہ سے گذر دالان میں ہوتی ہوئی صحن میں پہنچی۔ اور نہایت غصیلی آواز میں کہا "نکل جاؤ، ابھی میرے گھر سے نکل جاؤ۔ نہ تم مجھ سے پڑھنے کے قابل ہو اور نہ میں تمھارے پڑھانے کے لائق" دانی نے میری طرف دیکھا۔ میں نے دانی کی طرف دیکھا۔ اُنھوں نے

آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا "چلو" میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا "ہرگز نہیں" اُنھوں نے اٹھنے کا ارادہ کیا۔ میں نے اُن کا زانو دبا دیا۔ مولوی صاحب کی یہ حالت تھی کہ شیر کی طرح بپھر رہے تھے۔ آخر جب دیکھا کہ یہ لونڈے ٹس سے مس نہیں ہوتے تو کہنے لگے کہ "اب جاتے یا نہیں" میں نے کہا "مولوی صاحب جب تک کوئی دھکے دیکر نہ نکالے گا اُس وقت تک تو ہم جاتے نہیں اور جائیں گے تو پھر ابھی آجائیں گے" مولوی صاحب نے جو یہ بیحیائی دیکھی تو ذرا نرم ہوئے۔ کہنے لگے اچھا نہیں جاتے تو نہ جاؤ مگر میں تم کو ایک حرف نہ پڑھاؤں گا" میں نے کہا "نہ پڑھائیے مگر بغیر پڑھے ہم یہاں سے نہ ٹلے ہیں نہ ٹلیں گے" کہنے لگے "بیٹا اس وقت میری طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ اب چلے جاؤ۔ کل آجانا" داغ نے سچ جانا، میں سمجھا کہ اس وقت اُٹھے اور مولوی صاحب ہاتھ سے گئے۔ داغ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے پکڑ کر اُن کو بٹھا لیا مولوی صاحب یہ تماشا دیکھتے رہے۔ میں نے کہا "مولوی صاحب پڑھیں گے تو آج پڑھیں گے اور آج پڑھیں گے تو اس وقت پڑھیں گے۔ پڑھانا ہے تو پڑھائیے۔ ورنہ ہم یہاں سے نہ جاتا ہے نہ جائیں گے" آخر کار ہم جیتے اور مولوی صاحب ہارے۔ کہنے لگے "خدا محفوظ رکھے تم جیسے شاگرد بھی کسی کے نہ ہونگے۔ شاگرد کیا ہوئے اُستاد کے اُستاد ہوگئے۔ اچھا بھئی میں ہارا، میں ہارا، جاؤ خدا کے لیے کتاب اُٹھا لاؤ اور سبق پڑھ کر میرا پینڈ چھوڑو، دیکھئے کون سا دن ہوتا ہے کہ میرا تم سے چھٹکارا ہوتا ہے" میں جا کر صحن میں سے کتاب اُٹھا لایا اور

کسی نہ کسی جگہ پھنسا دینا چاہتے ہیں۔ خواہ اس کی گنجائش وہاں ہو یا نہ ہو، جناب والا اہل زبان کو یہ دکھلانے کی ضرورت نہیں کہ وہ محاوروں پر حاوی ہے۔ یہ صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو دوسروں کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہم باہر والے نہیں دہلی والے ہیں۔" تھوڑی دیر تو حجت کرتے، اس کے بعد کہتے "اچھا بھئی تم ہی دہلی والے سہی، ہم تو اسی طرح لکھیں گے جس طرح اب تک لکھا ہے۔ تم ہم کو دہلی والوں کی فہرست سے نکال دو، مگر میاں اپنا ہی نقصان کروگے۔"

مجھ کو مولوی صاحب کی طرز تحریر پر کوئی رائے ظاہر کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ اول تو میرے لیے ابتدا ہی میں "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست" کی سب سے بڑی ٹھوکر ہے۔ دوسرے میری قابلیت محدود کی سرحد سے گزر کر مفقود سرحد میں آگئی ہے۔ لیکن باوجود ان موانعات کے میں نے مولوی صاحب کے سامنے بھی کہا اب بھی کہتا ہوں اور ہمیشہ کہوں گا کہ محاوروں کے استعمال کا شوق مولوی صاحب کو حد سے زیادہ تھا۔ تحریر میں ہو یا تقریر میں وہ محاوروں کی ٹھونسم ٹھانس سے عبارت کو بے لطف کر دیتے تھے، اور بعض وقت ایسے محاورے استعمال کر جاتے تھے جو بے موقع ہی نہیں اکثر غلط ہوتے تھے۔ خدا معلوم انھوں نے محاوروں کی کوئی فرہنگ تیار کر رکھی تھی یا کیا کہ ایسے ایسے محاورے ان کی زبان اور قلم سے نکل جاتے تھے جو نہ کبھی دیکھے نہ سنے۔ ان کی عبارت کی روانی اور بے ساختگی کا جواب دوسری جگہ ملنا مشکل ہے مگر چلتے چلتے راستہ میں عربی الفاظ کے روڑے ہی نہیں بچھاتے تھے۔

پہاڑ رکھ دیتے تھے۔ غرض یہ تھی کہ لوگ یہ جان لیں کہ میں دہلی والا ہی نہیں ہوں۔ مولوی بھی ہوں۔ بہرحال ان کی تحریر کا ایک خاص رنگ ہے اور اس کی نقل اُتارنا مشکل اور بہت مشکل ہے۔ ترجمہ کرنے کا انہیں خاص ملکہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ کئی زبانوں پر حاوی تھے۔ اگر ایک زبان کے لفظ سے مطلب ادا نہ ہوا تو دوسری زبان کا لفظ وہاں رکھ دیا۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

سنہ ۱۹۰۳ء کے دربار تاجپوشی پر جو انگریزی کتاب لکھی گئی تھی اُس کا ترجمہ مولوی صاحب کے سپرد ہوا۔ ایک روز جو ہم پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ خوبصورت سی جلد کی ایک بڑی موٹی کتاب مولوی صاحب کی میز پر رکھی ہے، ہم نے اجازت لے کر کتاب اٹھائی اور اوّل سے آخر تک ساری تصویریں دیکھ ڈالیں۔ اول تو مولوی صاحب بیٹھے دیکھتے رہے، پھر کہنے لگے "بیٹا یوں سرسری نظر سے کیا دیکھتے ہو گھر لے جاؤ، اچھی طرح پڑھو۔ مگر دیکھو خراب نہ کرنا" ہم دونوں نے دل میں سوچا کہ خدا معلوم یہ کیا بھید ہے جو مولوی صاحب بغیر مانگے اپنی کتاب دے رہے ہیں۔ خوش خوش کتاب بغل میں مار گھر آئے۔ دو ایک روز میں پڑھ ڈالا۔ ایک آدھ تصویر بھی غائب کردی۔ چوتھے روز کتاب لے جا مولوی صاحب کے حوالہ کی "پوچھا" کہو پسند آئی"، مولوی صاحب خوب کتاب ہے" کہنے لگے "اچھی کتاب ہے تو ترجمہ کر ڈالو" ہم نے کورا جواب دیدیا۔ کہا "دیکھو، سنو، اس کتاب کا مجھے ترجمہ کرنا ہے۔ تم سے ترجمہ کراؤں گا، صحیح میں کردوں گا۔ اب مجھ میں اتنا دم نہیں کہ اتنی بڑی

کتاب کا ترجمہ کرسکوں۔ اگر آپ کے انکار کیا تو کل سے گھر میں گھسنے نہ دوں گا۔" یہ کہتے کہتے کتاب کی جلد توڑ دس صفحے میرے اور دس میاں دانی کے حوالہ کر دیے۔ ساتھ ہی میاں رحیم بخش کو آواز دی وہ آئے اُن کو حکم دیا کہ ایک ایک دستہ بادامی کاغذ کا ان دونوں کو دے دو، قہر درویش بر جانِ درویش کی صورت تھی۔ جس طرح پہلے خوشی خوشی پوری کتاب لے گئے تھے اسی طرح مُنہ بنائے ہوئے اُن پلندوں کو بغل میں مارا۔ گھر آکر بیگار کے کام کی طرح ترجمہ کیا۔ دوسرے روز جاکر پڑھنے کے لیے کتاب اٹھائی۔ پوچھا "ترجمہ لائے"۔ ہم نے دبی آواز میں کہا :- "لائے"۔ کہا "پہلے وہ پڑھو" ہم پڑھتے جاتے اور مولوی صاحب اصل کتاب دیکھ کر اُس کی درستی کرتے جاتے۔ اب اگر میں یا میاں دانی کہیں کہ یہ ترجمہ ہمارا ہے تو یقین مانیے کہ دونوں جھوٹے ہیں۔ مولوی صاحب کی اصلاح نے ہماری آنکھیں کھول دیں اور ہم نے سمجھ لیا کہ اس علم میں بھی مولوی صاحب سے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے اس کے بعد سے ہمیں ترجمہ کا شوق ہوگیا اور تھوڑے ہی دنوں میں کتاب ختم ہوگئی، اس کے چھپنے کے بعد ہماری مولوی صاحب سے بڑی جنگ ہوئی۔ کیونکہ بندۂ خدا نے ہم دونوں غریبوں کا اس میں ذرا بھی ذکر نہیں کیا۔ مگر کچھ پروا نہیں، اس کا بدلہ ہم اب لیے لیتے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ کہے دیتے ہیں کہ اس کتاب میں تھوڑے بہت لفظ ہم دونوں کے بھی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اگر اصلاح شدہ مسودوں کو دیکھا جائے تو کانٹ چھانٹ کی وجہ سے ہمارے لفظوں

کا تلاش کرنا سر میں لیکھیں دیکھنے سے کم مشکل نہ ہوگا۔ ہاں، تو
میں یہ کہہ رہا تھا مولوی صاحب چونکہ کئی زبانوں پر حاوی تھے
اس لیے اُن کو کہیں نہ کہیں سے مناسب لفظ ادائے مطلب کے
لیے ضرور مل جاتا تھا۔ مثلاً اسی جشن تاجپوشی کی کتاب میں ایک
جگہ (stallion) آیا۔ ڈکشنری میں جو دیکھا تو اس
کے معنی "سیاہ بڑا جنگی گھوڑا" نکلے۔ یاروں نے ترجمہ میں وہی الفاظ
ٹھونک دیے۔ جب مولوی صاحب نے یہ الفاظ سُنے تو بہت ہنسے کہنے
لگے "واہ بیٹا، واہ، کیوں نہ ہو دہلی والے ہو۔ خالص اُردو لکھی ہے،
بندۂ خدا "شبدیز" لکھ دو۔ چلو چھٹی ہوئی" اب کوئی صاحب
اس سے بہتر لفظ بتا دیں تو میں جانوں، ان کے ترجمہ میں خوبی یہ
ہوتی تھی کہ لفظ کی جگہ لفظ بٹھاتے تھے۔ لیکن وہ لفظ ایسا ہوتا
تھا کہ وہاں نگینہ بن جاتا تھا۔ تعزیرات ہند کا ترجمہ اُٹھا کر دیکھو
وہی لفظ پر لفظ ہے معنی بھی پورے دیتا ہے اور اپنی جگہ سے ہل بھی
نہیں سکتا۔ سینکڑوں کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ دوسری اشاعت میں
کچھ اور تیسری میں کچھ سے کچھ ہو گئے۔ لیکن تعزیرات ہند کا ترجمہ
جوں کا توں ہے۔ ایک لفظ اِدھر سے اُدھر نہیں ہوا۔ کہا کرتے تھے
کہ "تعزیرات ہند کا ترجمہ بھی میرا ایک کارنامہ ہے۔ اس کتاب
کے ترجمہ کا کام تین آدمیوں کے سپرد ہوا تھا، ان میں ایک مولوی
عظمت اللہ صاحب تھے۔ اس کی اصلاح ڈائرکٹر صاحب کے ذمہ تھی،
اور ہم ڈائرکٹر صاحب کے رشتہ دار تھے، روزانہ ایک دو دفعات
کا ترجمہ آتا۔ ہم ڈائرکٹر صاحب کو جتاتے، وہ بڑا غل مچاتے کہ

"یہ لفظ خلاف محاورہ ہے اس لفظ سے مفہوم ادا نہیں ہوتا، یہ لفظ اپنی طرف سے بڑھا دیا گیا ہے۔" غرض دو تین دفعات کہیں تین چار گھنٹے میں پاس ہوتیں، مجھے بڑا تاؤ آتا تھا کہ ترجمہ کرے کوئی، یہ باتیں سنے کوئی، مگر بھئی یہ ضرور کہوں گا کہ وہ بھلا آدمی جو بات کہتا تھا باون تولے پاؤ رتی کی کہتا تھا، جو اعتراض کرتا تھا وہ اٹھائے نہ اٹھتا تھا، میاں پرانے زمانہ کے انگریز غضب کی اردو سمجھتے تھے۔ گو اچھی اردو لکھ نہ سکیں، مگر ترجمہ کی وہ وہ غلطیاں نکالتے تھے کہ تم جیسے دہلی والوں کے کان پکڑوا دیں، میں بھی ترجمہ دیکھتا تو واقعی کچھ اکھڑا اکھڑا معلوم ہوتا، میں نے دل میں کہا کہ نذیر احمد تو بھی خم ٹھونک کر میدان میں کیوں نہیں آ جاتا اردو جانتا ہے، فارسی جانتا ہے، عربی جانتا ہے، کچھ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی سمجھتا ہے، ان لوگوں سے اچھا نہیں تو کم سے کم ایسا ترجمہ تو بھی کر لے گا۔ یہ سوچ سوا روپیہ کی رائل ڈکشنری بازار سے خرید لایا، رات کو لیمپ جلا، کپڑے اتار، لنگوٹ باندھ، ترجمے پر پل پڑا، جن دفعات کا ترجمہ دوسرے روز پیش ہونے والا تھا ان کا ترجمہ خود کر ڈالا۔ دوسرے دن ترجمہ جیب میں ڈال دفتر پہنچا، ڈائرکٹر صاحب آئے مجھے بلایا اور ان لوگوں کے ترجمے کو سن کر وہی گڑبڑ شروع کی، خدا خدا کر کے یہ مشکل آسان ہوئی، میں نے کہا کہ کمترین بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہے، کہا "اچھا کہو۔" میں نے جیب میں سے کاغذ نکالا وہ سمجھے عرضی ہے لینے کو ہاتھ بڑھایا میں نے کہا "عرضی نہیں ہے۔ آج کی دفعات کا ترجمہ میں نے کیا ہے۔" ڈائرکٹر صاحب یہ سن کر اچھل پڑے۔ کہنے لگے

"تم نے۔ تم نے ترجمہ کیا ہے، تم کو تو انگریزی نہیں آتی، پھر ترجمہ کیسے کیا؟" میں نے کہا "رائل ڈکشنری سے"، اُنھوں نے ہنس کر کہا "تعزیرات کا ترجمہ رائل ڈکشنری سے نہیں ہوا کرتا" میں نے کہا "سُن تو لیجیے"، کہا "اچھا سناؤ" میں نے جو پڑھا تو صاحب بہادر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، کہنے لگے "یہ ترجمہ تم نے رائل ڈکشنری سے کیا ہے؟" میں نے کہا "ہاں"، کہنے لگے "کل شروع کی چار دفعات کا ترجمہ کرکے لاؤ" میں دوسرے دن لے کر گیا۔ بہت پسند کیا اور کہا "تم نے پہلے ہی کیوں نہ کہا کہ میں ترجمہ کر سکتا ہوں جو میرا اتنا وقت ضائع کرایا جاؤ تم بھی اُن ترجمہ کرنے والوں میں شریک ہو جاؤ" اُس دن سے ہم بھی پانچوں سواروں میں مل گئے اور یہی ہماری ترقی کا زینہ تھا۔ اب رہے ہماری تصنیفات پر انعام، وہ تو اللہ میاں نے چھپّر پھاڑ کر دیے ہیں، اگر کوئی کہتا بھی کہ مراۃ العروس پر تم کو انعام ملے گا تو میں اس کو دیوانہ سمجھتا، اصل یہ ہے کہ یہ کتاب میں نے اپنی لڑکی کے لیے لکھی تھی، وہی پڑھا کرتی تھی۔ میاں بشیر کو "چند پند" لکھ دی تھی۔ میں اس زمانہ میں تعلیمات کا انسپکٹر تھا، دورے پر نکلے تھے، بال بچے ساتھ تھے، ایک جگہ ٹھیرے تھے کہ مسٹر کیمپ سن ڈائرکٹر کا ڈیرہ بھی قریب آلگا، شام کا وقت تھا۔ میاں بشیر اپنی ٹٹوانی پر سوار ہوکر ہواخوری کو نکلے۔ اُدھر سے ڈائرکٹر صاحب آرہے تھے۔ میاں بشیر نے جھک کر سلام کیا۔ صاحب ٹھہر گئے، پوچھا "میاں تمھارا کیا نام ہے" انھوں نے نام بتایا، پھر پوچھا "تمھارے والد کون ہیں" انھوں نے میرا نام بتایا۔

پھر پوچھا "کہو میاں کیا پڑھتے ہو" انھوں نے کہا "چند پند" ڈائرکٹر صاحب سمجھے تھے کہ اُردو کی پہلی یا دوسری کہیگا "چند پند" کا نام سُن کر پریشان ہوئے۔ کیونکہ اس عجیب و غریب نام سے اُن کے کان نا آشنا تھے کہا "ہمیں اپنی کتاب دکھاؤ گے"۔ بشیر نے کہا "جی ہاں ابھی لاتا ہوں ہماری، آپا کی بھی کتاب دیکھیئے گا"۔ انھوں نے کہا "اُس کتاب کا کیا نام ہے؟" انھوں نے کہا "مرأۃ العروس" یہ دوسرا نیا نام تھا۔ صاحب نے کہا "ہاں وہ بھی لاؤ" میاں بشیر ٹوڑانی سے کود بھاگتے ہوئے ڈیرے میں آئے۔ اپنا جزدان کھول "چند پند" نکالی۔ اُس کے بعد اپنی بہن کے جزدان پر قبضہ کیا، اُس نے جو دیکھا کہ بشیر جزدان ٹٹول رہا ہے۔ تو دوڑتی ہوئی گئی۔ اتنے میں بشیر مرأۃ العروس لے کر بھاگا۔ یہ اُس کے پیچھے بھاگی، دونوں میں بڑی دھینگا مشتی ہوئی، خوب رونا پیٹنا ہوا، بشیر بہن کو دھکا دے کتاب لے یہ جا وہ جا، بہن صاحبہ نے دل کا بخار آنسو بہا کر نکالا، میاں بشیر نے دونوں کتابیں لے جا صاحب کے حوالہ کیں۔ انھوں نے الٹ پلٹ کر کچھ پڑھا اور بشیر سے کہا "ہم یہ کتابیں لے جائیں، کل بھجوا دیں گے"۔ انھوں نے کہا "لے جائیے۔ کل ہم کو چھٹی رہے گی"۔ میں جو ڈیرے میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قیامت مچ رہی ہے، لڑکی نے رو رو کر آنکھیں لال کرلی ہیں۔ میاں بشیر ڈرے سہمے ڈیرے کے ایک کونے میں دبکے بیٹھے ہیں، میرا اندر قدم رکھنا تھا کہ فریاد کی صدا بلند ہوئی۔ صاحبزادی نے رو رو کر اس طرح واقعہ بیان کیا جس طرح کسی عزیز کے مرنے کا کوئی بین کرتا

ہے، میں نے بشیر کو بلایا وہ ڈرے کہ کہیں ٹھکائی نہ ہو جائے، پہلے ہی سے بسورنا شروع کیا۔ وہ دبے جاتے تھے اور بہن شیر ہوئی جاتی تھی آخر بڑی مشکل سے اتنا معلوم ہوا کہ ایک انگریز دونوں کتابیں لے کر چلا گیا۔ میں نے جا کر سائیس سے پوچھا کہ وہ انگریز کون تھا۔ تو معلوم ہوا کہ سامنے جو ڈیرے میں پڑے ہیں اُن میں وہ اُترے ہیں، مجھے بڑا تعجب ہوا کہ بھلا ڈائرکٹر صاحب کو بچّوں کی کتابوں سے کیا کام۔ خیر لڑکی کو دلاسا دیا کہ میں لا دوں گا، نہیں تو دوسری لکھ دوں گا۔ اُس نے کہا کہ میں لونگی تو وہی کتاب لونگی، بڑی مشکل سے اس کا غصّہ ٹھنڈا کیا۔ اب فکر ہوا کہ صاحب سے پوچھوں تو کیونکر پوچھوں۔ سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ صاحب کا مطلب اس طرح بچّوں کی کتابیں منگوانے سے کیا ہو سکتا ہے، غرض اس شش و پنج میں صبح ہو گئی۔ کوئی سات بجے ہونگے کہ صاحب کا چپراسی آیا اور کہا کہ صاحب سلام بولتے ہیں وہاں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ صاحب بیٹھے مرأۃ العروس پڑھ رہے ہیں، سلام کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ صاحب نے کہا "مولوی صاحب آپ نے ایسی مفید اور دلچسپ کتابیں لکھیں اور طبع نہ کرائیں اگر کل آپ کا لڑکا مجھ کو نہ ملتا تو شاید کوئی بھی ان کتابوں کو نہ دیکھتا اور چند ہی روز میں بچّوں کے ہاتھوں یہ کتابیں پھٹ پھٹا کر برابر ہو جاتیں، اگر آپ اجازت دیں تو میں مراۃ العروس کو سرکار میں پیش کر دوں۔ آج کل گورنمنٹ ایسی کتابوں کی تلاش میں ہے جو لڑکیوں کے نصاب تعلیم میں داخل ہو سکیں۔" میں نے کہا "آپ کو اختیار ہے" یہ کہہ کر میں چلا آیا۔ صاحب نے وہ کتاب

گورنمنٹ میں پیش کردی۔ وہاں سے انعام ملا، یہاں شیر کے منہ کو خون لگ گیا۔ اوپر تلے کئی کتابیں گھسیٹ ڈالیں، جو کتاب لکھی اُس پر انعام ملا۔ جو لکھا پسند کیا گیا۔ غرض ہم مصنّف بھی بن گئے اور ساتھ ہی ڈپٹی کلکٹر بھی ہوگئے۔ مگر بھئی بات یہ ہے کہ انسان کا عہدہ جتنا بڑھتا جاتا ہے، اُسی طرح اس کی فرصت کا وقت بھی گھٹتا جاتا ہے۔ یہی مصیبت ہم پر پڑی ادھر کام کی زیادتی، اُدھر سرسید کی فرمائشوں کی بھرمار، آج یہاں لکچر دیا، کل وہاں دیا، تصنیف کا سلسلہ ہی ٹوٹ گیا، خدا خدا کرکے بڑھاپے میں فرصت ملی تو قرآن شریف حفظ کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ شوق ہوا کہ اس کا ترجمہ بھی کرلو، لوگوں کو بھی مفید ہوگا، اور شاید تمھاری نجات کا بھی ذریعہ ہوجائے، غرض جتنی محنت ممکن تھی اتنی محنت کی، اسی ترجمے کے سلسلے میں "الحقوق والفرائض" کا مواد بھی جمع کرلیا، کلام مجید کی دعاؤں کو بھی ایک جگہ اکٹھا کرلیا۔ غرض ایک نہیں اور کئی کام ہوگئے، مگر بھئی سچ کہنا کیسا ترجمہ کیا ہے؟" میں تو خاموش رہا مگر دانی نے کہا کہ "مولوی صاحب ہم کو اس ترجمے کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا" مولوی صاحب نے کہا "ہیں میاں دانی! یہ کیا کہا، تم نے ابھی تک میرا ترجمہ نہیں دیکھا، بھئی غضب کیا۔ ارے میاں رحیم بخش ذرا اِدھر تو آنا، وہ جو سنہری جلد کی حمائل شریف ہے وہ میاں دانی کو دے دو، بیٹا ذرا اس کو غور سے پڑھو، دیکھو تو میں نے اس بڑھاپے میں کیا محنت کی ہے" غرض، حمائل شریف میاں

دانی کے قبضہ میں آگئی، انھوں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ آپ کی یادگار رہے گی، جب ہم اُٹھ کر چلنے لگے تو مولوی صاحب نے دانی سے کہا:۔ ارے بھئی ایک بات تو کہنی بھول گیا، اس حمائل شریف کا ہدیہ ساڑھے پانچ روپئے ہے۔ کل ضرور لیتے آنا۔" بچارے کا شکریہ اکارت گیا اور دوسرے روز پورے ساڑھے پانچ روپیے مولوی صاحب نے دھروالیے۔

مولوی صاحب نے کئی مرتبہ اس عاجز پر بھی رقمی حملے کیے۔ لیکن یہ ذرا ٹیڑھا مقابلہ تھا، ایک چھوڑ کئی کتابیں مولوی صاحب سے اینٹھیں کبھی ایک پیسہ نہ دیا یہ نہیں کہ خدانخواستہ وعدہ کرتا اور رقم نہ دیتا تھا یہ کہ اُس وقت تک کتاب لینا ہی نہ تھا جب تک مولوی صاحب خود نہ فرما دیتے کہ "اچھا بھئی۔ تو یوں ہی لے جا۔ مگر میرا پیچھا چھوڑ"، میری ترکیب یہ تھی کہ پہلے کتاب پہ قبضہ کرتا، مولوی صاحب قیمت مانگتے، میں حجت کرتا، وہ جواب دیتے میں اُس کا جواب دیتا۔ غرض بہت کچھ جھک جھک کے بعد تھک کر کہتے کہ جاؤ میں نے قیمت معاف کی، آئندہ میری کسی کتاب کو ہاتھ لگایا تو اچھا نہ ہوگا، مگر خدا غریقِ رحمت کرے ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب مجھ کو دے دیتے تھے اور جان جان کر جھگڑتے تھے، ریویو کے لیے جو کتابیں آتیں وہ تو ہمارے باپ دادا کا مال تھیں، وہ پورا ریویو لکھنے بھی نہ پاتے کہ کتاب کے صفحہ اوّل پر میرا نام درج ہوکر شہادت دستاویزی اور ثبوت قبضہ کی شکل اختیار کر لیتا۔ اس وقت بھی میرے پاس اُس زمانہ کی بعض کتابیں موجود ہیں، معلوم

نہیں کہ میاں دانی کو جو حمائل شریف عطا ہوئی تھی وہ اُن کے پاس رہی یا نہیں۔

کتابیں تو کتابیں میں نے مولوی صاحب کی ایل۔ایل ڈی کی گون پر قبضہ کرنے کا فکر کیا تھا، ہوا یہ کہ جب میں اور دانی بی۔اے میں پاس ہوئے تو جلسہ تقسیم اسناد کے لیے لاہور جانا پڑا، گون بنوانا بے ضرورت سمجھا گیا۔ اب خیال ہوا کہ گون کس کی چھینیں۔ دانی کو تو گون مل گئی، میں نے مولوی صاحب کی گون تاکی۔ ہم دونوں مل کر اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی ضرورت کا اظہار کیا۔ کہنے لگے "بیٹا! میری گون بڑی قیمتی ہے، ساڑھے چھ سو روپئے میں دو گونیں پڑی ہیں۔ بھلا میں کیا خریدتا، یہ میاں مشرف نے میرے سر منڈھ دیں، وہ ایڈنبرا میں پڑھتے تھے۔ مجھے لکھا کہ اپنی تمام تصنیفات و تالیفات کی نہایت عمدہ جلدیں بندھوا کر بھجوا دیجیے۔ سر ولیم میور دیکھنا چاہتے ہیں۔ سر ولیم میور پہلے ممالک مغربی و شمالی کے لفٹننٹ گورنر تھے۔ مجھ پر بھی بہت مہربان تھے، میں نے مشرف کے لکھے کو سچ جانا، کتابوں کی جلد بندھوا ایڈنبرا روانہ کر دیں، ان کتابوں میں میرا کلام مجید کا ترجمہ بھی تھا، وہ بہت پسند کیا گیا۔ سر ولیم میور نے یہ کتابیں ایڈنبرا یونیورسٹی میں پیش کر دیں، اور ہمیں گھر بیٹھے ایل۔ایل۔ڈی کی ڈگری مل گئی، مگر اس ڈگری کی اطلاع میرے پاس بعد میں آئی۔ پہلے درزی کا خط اور بل آیا کہ مسٹر مشرف کی فرمایش کے بموجب ایل۔ایل۔ڈی کی ایک سیاہ اور ایک سُرخ گون مع ٹوپی کے روانہ کی گئی ہے۔ براہِ کرم جس قدر

جلد ممکن ہو ساڑھے چھ سو روپئے روانہ فرمائیے۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ یا تو مشرف دیوانہ ہو گیا ہے یا یہ درزی پاگل ہے کہ بیٹھے بٹھائے بل روانہ کر رہا ہے، یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گون کا پلندہ بھی آگیا۔ غرض اسی کشمکش و پیچ میں ایک ہفتہ گذر گیا۔ دوسری ڈاک سے ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری ملنے کا مراسلہ اور میاں مشرف کا خط ملا، قہر درویش بر جانِ درویش، درزی صاحب کو رقم روانہ کی۔ مشرف کو بُرا بھلا لکھا کہ وہاں سے یہ تھیلے بنوا کر بھجوانے کیا ضرور تھے، میں یہاں اپنے ناپ کی گون بنوا لیتا بہرحال یہ گونیں ساڑھے چھ سو روپئے کی ہیں۔ معاف کیجیے۔ میں نہیں دے سکتا، جا کسی پروفیسر کی گون چھین کر کیوں نہیں لے جاتا، جو میرے پیچھے پڑا ہے، میں یہ قصہ چپکا بیٹھا سنتا رہا، اس کے بعد بغیر کچھ کہے سُنے اُٹھا اور مولوی صاحب کے سامان کی کوٹھری کا رُخ کیا۔ وہ "ہاں ہاں" کہتے ہی رہے۔ میں نے کنڈی کھول اندر گھس، الماری میں سے کالی گون نکال ہی لی۔ جب مولوی صاحب نے دیکھا کہ پانی سر سے گذر گیا تو سنبھل سنبھلا کر اٹھے، میں اتنی دیر میں دروازہ بند کر گون بغل میں مار پھر اپنی جگہ آگیا۔ مولوی صاحب بھی بیٹھ گئے اور اب انھوں نے گون کی قیمت، میری لاپروائی، ریل میں چوری کے خطرات، بی۔ اے اور ایل۔ ایل۔ ڈی کی گون کے اختلاف، غرض اسی طرح بیسیوں چیزوں پر لکچر دے ڈالے، میں بیٹھا سنتا رہا۔ جب وہ کہتے کہتے تھک گئے تو میں نے لکچر شروع کیا۔ اُستادوں کی محبت، اپنی غربت، گون کی صرف ایک روز کی ضرورت،

وقت کی قلت، غرض دس بارہ پہلوؤں پر میں نے بھی اسپیچ دے دی
اور آخر میں صاف کہہ دیا کہ یہ گون میں لے کر جاؤں گا، اور ضرور
لے کر جاؤں گا۔ اس کے بعد مولوی صاحب کچھ نرم پڑے۔ کہنے لگے
"واپس کب کروگے" میں نے کہا "آپ سرخ گون پہنتے ہیں کالی
گون مجھے دے دیجیے۔ آپ کا کچھ نقصان نہ ہوگا اور ایک غریب کا
فائدہ ہوجائے گا"۔ مولوی صاحب نے کہا "نہیں بیٹیا! لاہور سے
آکر دے دیجیو، مجھے دربار وغیرہ میں یہ گون بھی پہننی پڑتی ہے"۔ یہ
الفاظ انھوں نے کچھ ایسے لہجے میں کہے کہ مجھے بھی وعدہ کرتے ہی
بن پڑی، آخر میں گون لے کر گیا اور لاہور سے آکر واپس کردی۔
جب مولوی صاحب نے گون پر قبضہ کر لیا اُس وقت بہت خفا ہوئے۔
کہنے لگے "اب کے تو اگر میری کوٹھری میں گھسا تو اچھا ہی نہ ہوگا کل
کو میرا کیش بکس اٹھا کر لے جائیگا، خیر دائی گون لے جاتا تو کچھ حرج
نہ تھا۔ کیونکہ واپسی کی تو امید رہتی۔ مجھے کب امید تھی کہ آپ بزرگ
واپس کبھی کریں گے، وہ تو کچھ میرا حلال کا مال تھا جو واپس آگیا"۔
میں نے کہا "مولوی صاحب اگر مجھے پہلے سے معلوم ہوجاتا کہ آپ کو
گون کی واپسی کی توقع نہیں ہے تو آپ اس کی تمام عمر شکل بھی نہ
دیکھتے"۔ ہنس کر کہنے لگے "چلو مشتے بعد از جنگ کی صورت ہے۔
آئندہ میں دینے میں احتیاط کروں گا اور تم واپسی میں احتیاط کرنا"۔
اُس وقت تو یہ باتیں ہنسی میں ہوئیں، مگر اب افسوس ہوتا ہے۔
گون اگر میرے پاس رہ جاتی تو مولوی صاحب کی یادگار ہوتی۔ کیا
یہ ممکن ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ وہ گون میرے پاس بھیج دے۔ کیونکہ

اس میں میرا بھی حق ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ گون مولوی صاحب نے
مجھ کو دی تو نہ تھی، لیکن وہ سمجھ چکے تھے کہ یہ میرے ہاتھ سے گئی۔
میری غلطی تھی جو اُس کو لے جا کر واپس کیا۔ اب اگر مل گئی تو کبھی ایسی
غلطی نہ کروں گا۔

جس طرح مسٹر مشرف نے یہ گونیں مولوی صاحب کے گلے منڈھی
تھیں، اسی طرح نواب محسن الملک نے حیدر آباد میں فرنیچر اُن کے سر
چیپک دیا تھا۔ اُس زمانہ میں حیدر آباد میں نواب محسن الملک کا
طوطی بول رہا تھا۔ اُن کی تجویز اور سرسید کی تحریک پر مولوی صاحب
حیدر آباد آئے۔ پہلے نواب محسن الملک ہی کے ہاں قیام کیا۔ اُس کے
بعد علیحدہ کوٹھی میں جا رہے۔ ہندوستانی وضع کا سامان تخت،
چوکیاں وغیرہ، خریدیں، بھلا محسن الملک یہ کیونکر دیکھ سکتے تھے کہ
اُن کا دوست پُرانی وضع کے لوگوں کی طرح زندگی بسر کرے، ایک
روز سکندر آباد جا، ایلن اینڈ کمپنی کو کئی ہزار کے فرنیچر کا آرڈر دے دیا
اور کہہ دیا کہ مولوی صاحب کے ہاں پہنچا دو اور بل بنا کر بھیج دو۔
ایک روز جو مولوی صاحب اُٹھتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ چھکڑے
پر چھکڑا فرنیچر کا لدا کوٹھی کے باہر کھڑا ہے۔ بہت چکرائے، لینے سے
انکار کیا۔ مگر وہ نواب محسن الملک کا بڑھایا ہوا جن تھا۔ وہ کب
ماننے والا تھا۔ آخر لاچار گھر چھوڑ باہر آ بیٹھے، اور دن بھر میں
مولوی صاحب کا مکان صاحب بہادر کی کوٹھی ہو گیا۔ مگر یہ بھی
نذیر احمد تھے۔ کچھ ایسی چال چلے کہ جب ان کا تقرر پیش جیرو کی صدر
تعلقداری پر ہوا تو وہ سب کا سب سامان بہت ہی تھوڑی کمی پر

الین ہی کے سر مارا، اور پٹن چیرو ہی اپنے پرانے تخت وغیرہ لے گئے۔ نواب محسن الملک کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوئی۔ اب آگے کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔ نواب محسن الملک دورہ پر نکلے، پٹن چیرو قیام کیا۔ مولوی صاحب خود کہیں دورہ پر گئے ہوئے تھے، نواب صاحب نے گھر میں کہلا بھیجا کہ میں آیا ہوں میرے قیام کا انتظام کردو۔ ایک کمرہ جس میں دو تین کرسیاں اور ایک دو میزیں تھیں کھول دیا گیا۔ وہ الین والے فرنیچر کی تلاش میں تھے۔ سمجھے کہ مولوی صاحب نے اپنے کمرے میں سجا کر رکھا ہوگا۔ اندر کہلا بھجوایا کہ میں مولوی صاحب کے کمرے میں ٹھیروں گا، پہلے تو جواب ملا کہ وہاں آپ کو تکلیف ہوگی، مگر جب ادھر سے اصرار ہوا تو وہ کمرہ بھی کھول دیا گیا۔ اندر جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں صفاچٹ میدان ہے۔ نہ دری ہے نہ چاندنی، نہ میز ہے نہ کرسی، کمرے کے بیچ میں ایک چھوٹا سا تخت ہے، اس پر ایک کمبل پڑا ہوا ہے۔ بازو میں ایک چوکی پر رحل اور جا نماز رکھی ہے۔ کھونٹی پر کلام مجید لٹک رہا ہے۔ یہ بہت چکرائے، لوگوں سے پوچھا وہ "فرنیچر کہاں گیا" معلوم ہوا کہ آتے آتے مولوی صاحب اس کے کوڑے کرا دیے، بجائے ایک رات ٹھیرے اور صبح ہی کوچ بول دیا۔

کچھ عرصہ تک تو نواب محسن الملک اور ان کی بنی رہی بعد میں اتنی کھنچی کہ ٹوٹ گئی۔ مولوی صاحب کو یہ شکایت تھی کہ محسن الملک مجھ پر دباؤ ڈال کر کام نکالنا چاہتے ہیں۔ محسن الملک کو یہ شکایت تھی کہ مولوی صاحب میرے مخالف ہو کر میرے اکھاڑنے کی فکر میں

ہیں، غرض جب عماد السلطنت بہادر کا زمانہ آیا اور محسن الملک بہادر کی کمان چڑھی تو مولوی صاحب کو میدان سے ہٹ جانا ہی مناسب معلوم ہوا، دوسرے حیدرآباد میں صحبت کا جو رنگ تھا وہ ایسا نہ تھا جس میں مولوی صاحب کا رنگ جم سکتا۔ اُس زمانہ کے جو حالات مولوی صاحب بیان کیا کرتے تھے۔ اُن کا زبانِ قلم پر نہ آنا ہی زیادہ مناسب ہے۔

بعد میں دونوں بظاہر ملتے جلتے تھے، لیکن موقعہ پڑا تو ایک دوسرے کو پردے ہی پردے میں سنائے بغیر نہ رہتے تھے۔ ایک واقعہ تو خود میری آنکھوں کے سامنے گزرا ہے۔ سنہ ۱۹۰۳ء کے دربار کے موقعہ پر کانفرنس کا اجلاس دہلی میں اجمیری دروازہ کے باہر ہوا، اُس زمانہ میں نواب محسن الملک علی گڑھ کالج کے سکریٹری تھے، کانفرنس کے صدر ہز ہائینس سر آغا خاں تھے، آدمیوں کی یہ کثرت تھی کہ بیٹھنے کو پنڈال میں جگہ نہ تھی، ہر جلسہ میں کئی کئی رئیس آجاتے تھے۔ ایک پورا دن خاص مولوی صاحب کے لکچر کے لیے مقرر ہوا، مدت ہوئی تھی کہ مولوی صاحب نے پبلک میں لکچر دینا چھوڑ دیا تھا، اُس روز جو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب لکچر دیں گے خلقت ٹوٹ پڑی، لکچر شروع ہی ہوا تھا کہ لارڈ کچنر نے کہلا بھیجا کہ آج میں بھی آؤں گا، نواب محسن الملک نے ایسے باوقعت و ذی وجاہت مہمان کے استقبال کی تیاریاں شروع کیں۔ مولوی صاحب کے لکچر میں اس سے کھنڈت پڑتی تھی۔ پنڈال کے باہر ذرا گڑبڑ ہوئی اور محسن الملک سمجھے کہ لارڈ کچنر آگئے۔ اُٹھ کر باہر جاتے اور پھر آ بیٹھتے، اسی طرح وہ کوئی دو،

پندرہ دفعہ باہر گئے اور اندر آئے۔ مولوی صاحب بہت جز بز ہوئے، خفا بھی ہوئے مگر ان کی کون سنتا تھا۔ قصّہ مختصر یہ کہ لارڈ کچنر آہی گئے۔ نواب محسن الملک نے سب کا تعارف کرایا۔ مولوی صاحب نے خود اپنا تعارف کرلیا۔ لارڈ کچنر کہنے لگے "مولوی صاحب ہم نے کورس میں آپ کی کتابیں پڑھی ہیں۔ آج آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" مولوی صاحب نے کہا "لاٹ صاحب مجھے بھی آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، اور سب سے بڑی یہ خوشی ہوئی کہ آپ کی وجہ سے ایک معمّہ حل ہوگیا۔" لارڈ کچنر نے کہا "وہ کیا معمّہ تھا؟" مولوی صاحب نے کہا "ہمارے ہاں قیامت کی نشانیوں میں لکھا ہے کہ اس وقت ایسا تھلکہ ہوگا کہ حاملہ عورتوں کے حمل گر جائیں گے، سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ ایسی کیا مصیبت ہوگی کہ حمل گرادے گی، مگر آج یقین آگیا کہ جو کچھ لکھا ہے صحیح لکھا ہے۔ جب آپ کی آمد نے بڑے بڑے پیٹ والے بڈھوں کے حمل گرادیے تو کیا تعجب ہے کہ قیامت کی آمد عورتوں کے حمل گرادے۔" تمام پنڈال میں سناٹا ہوگیا۔ مگر مولوی صاحب کو جو کہنا تھا کہہ گئے اور اس طرح اپنے دل کا بخار نکال لیا۔ بات یہ ہے کہ وقت پر ایسی سوجھتی تھی کہ باید و شاید، چنانچہ امیر حبیب اللہ خاں ہی کے دربار کا واقعہ دیکھ لو۔

امیر حبیب اللہ خاں بقر عید کے دن دہلی میں تھے، اس روز جمعہ تھا صبح کو بقر عید کی نماز عید گاہ میں پڑھی اور جمعہ کی نماز جامع مسجد میں، شام کو سرکٹ ہاؤس میں دربار کیا۔ اس دربار میں ۸ یا ۹ دہلی کے ہندو امیر اور اسی قدر مسلمان مشاہیر بُلائے گئے۔ ان

میں ایک مولوی صاحب بھی تھے۔ سر ہنری میک موہن نے اُن لوگوں کا تعارف امیر صاحب سے کرایا۔ جب مولوی صاحب کی باری آئی اور اُن کی تعریف سر ہنری نے کی تو امیر صاحب نے کہا "آپ کو ان کی تعریف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود ان کی تصانیف بڑے شوق سے پڑھتا ہوں، اور تقریباً سب کا ترجمہ بھی کرا چکا ہوں، دیکھنے کا اشتیاق تھا وہ آج پورا ہوگیا" اس کے بعد باتوں ہی باتوں میں پوچھا "آپ شعر بھی کہتے ہیں؟" مولوی صاحب نے کہا "جی ہاں کہتا ہوں، لیکن آج آپ کی تعریف میں اپنا نہیں دوسروں کا شعر سناؤں گا" یہ کہہ کر متنبی کا یہ شعر پڑھا ؎

عیدٌ وعیدٌ وعیدٌ مجتمعاً[1] وجہ الحبیب ویوم العید والجمعا

موقعہ کے لحاظ سے یہ شعر ایسا برمحل ہوگیا کہ متنبی کو نصیب بھی نہ ہوا ہوگا۔ واقعات اور خاص کر حبیب کے لفظ نے شعر میں جان ڈال دی، تمام دربار چہک اٹھا۔ امیر حبیب اللہ خاں نے اُٹھ کر مولوی صاحب کو گلے سے لگا لیا اور اتنے بوسے دیے کہ مولوی صاحب گھبرا گئے، دوسرے روز جو اُنھوں نے اس واقعہ کا ذکر ہم سے کیا اُس کو اُنھی کے الفاظ میں دُھرانا اچھا معلوم ہوتا ہے کہنے لگے:-

"بھئی میں تو شعر پڑھ کر مصیبت میں پھنس گیا۔ شعر پڑھنا تھا کہ یہ معلوم ہوا کسی شیر نے آکر مجھے دبوچ لیا۔ اس میرے شیر کا کوئی سوا گز چوڑا سینہ، میں ٹھیرا چھوٹے قد کا آدمی اُس نے جو پکڑ کر بھینچا تو اِدھر تو ہڈیاں پسلیاں پلپلی ہوگئیں اُدھر دم گھٹنے لگا۔

---

[1] آج تین عیدیں جمع ہوگئی ہیں۔ حبیب کا دیدار ہے، عید کا دن ہے اور جمعہ ہے۔

اس کی گرفت سے نکلنے کی ہزار کوشش کرتا ہوں، جنبش تک نہ ہوتی۔ قسم خدا کی اس وقت تک ہڈیوں میں درد ہو رہا ہے۔ بارے خدا خدا کرکے گرفت ڈھیلی ہوئی تو میں ذرا علٰحدہ ہوا۔ ابھی پوری طرح سانس بھی نہ لینے پایا تھا کہ اُس نے میرے گلے میں باہیں ڈال بوسہ پر بوسہ لینا شروع کیا۔ بھلا مجھ بڈھے کو دیکھو اور امیر صاحب کی اس حرکت کو دیکھو۔ کچھ تعریف کا یہ طریقہ افغانستان ہی میں اچھا معلوم ہوتا ہوگا مجھے تو مارے شرم کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ اللہ کا بندہ ذرا دم لیتا اور سبحان اللہ کہہ کر پھر لپٹ جاتا، لپٹتا اور لپٹتے ہی بوسے پر بوسہ لینا شروع کرتا۔ بیچارے دوسرے بھلے آدمی بیٹھے ہوئے کیا کہتے ہوں گے۔ جب میں نے اس مصیبت سے رہائی پائی تو میری ناک سے پسینہ اس طرح بہ رہا تھا جس طرح کسی ٹوٹی صراحی میں سے پانی رستا ہے۔ نا بھائی نا، ایسے درباروں کو میرا دور ہی سے سلام ہے۔ کون شعر پڑھ کر اپنی ہڈیاں تڑوائے۔" مولوی صاحب اپنی ہڈیاں سہلاتے جاتے اور یہ قصہ بیان کرتے جاتے تھے، مگر اُن کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ خوشی کے مارے دل کھلا جا رہا ہے، اور سمجھ رہے ہیں کہ شعر کی داد اس طرح اور اس رنگ میں آج تک نہ کسی شاعر کو ملی ہے اور نہ ملے گی۔

اس تیزیٔ طبع کے ساتھ صاف گوئی بھی بلا کی تھی، جو کہنا ہوتا تھا وہ بغیر کہے نہ رہتے تھے۔ اس میں کسی لفٹنٹ گورنر پر ہی حملہ کیوں نہ ہو جائے۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں لارڈ کرزن کا ایک لکچر ہوا، اور اس میں انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ جب تک ہندوستانی یورپ والوں

کی طرح سچ بولنے کی عادت نہ ڈالیں گے اس وقت ہندوستان
ترقی نہیں کرسکتا۔ اخباروں میں یہ لکچر پڑھ کر مولوی صاحب کو
بہت غصہ آیا۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ اس کے چند ہی روز بعد
ہمارے کالج میں سالانہ جلسہ ہوا، اور لارڈ لیفرائے ہندوستان
کے لاٹ پادری تشریف لائے۔ شامت اعمال سے انھوں نے اپنے
لکچر کا موضوع یہی قرار دیا۔ کالج کی طرف سے لاٹ صاحب کا شکریہ
ادا کرنے کے لیے مولوی صاحب تجویز کیے گئے۔ اب کیا تھا، اللہ
دے اور بندہ لے، جو کچھ دل میں بخار بھرا تھا، خوب اچھی طرح
نکال لیا۔ کالج والے حیران تھے کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ مولوی صاحب
شکریہ ادا کر رہے ہیں یا لاٹ صاحب پر اعتراضات، مگر انھوں نے
جب تک اپنے دل کی بھڑاس اچھی طرح نہ نکال لی، خاموش
نہیں ہوئے۔ سب سے پہلے انھوں نے ہندوستان کے مغربی اثر کو
نہایت پُر مذاق پہلو سے بیان کیا۔ فرمانے لگے "حضرات پیجامہ
اچھا ہے یا پتلون، ہم پُرانے آدمی تو موسم کے لحاظ سے، اُٹھنے
بیٹھنے کی سہولت و آرام کے لحاظ سے پیجامہ ہی کو اچھا کہیں گے،
مگر آج کل کے ہندوستانی صاحب بہادر پتلون کا ساتھ دیں گے،
یہ کیوں؟ اس لیے کہ یہ انگریزوں کا پہناوا ہے، ہم اچکن یا انگرکھے
کو اچھا کہیں گے کہ اس سے ستر ڈھکتا ہے آدمی بھاری بھرکم معلوم
ہوتا ہے۔ ہمارے یورپ کے دلدادہ بھائی کوٹ کو پسند کریں گے۔
یہ کیوں؟ اس لیے کہ یہ انگریزوں کا پہناوا ہے۔ ہم بڈھے سلیم شاہی
جوتی پر جان دیں گے کیونکہ اس میں پیر کو آرام ملتا ہے، نرم نرم

اور سبک ہوتی ہے، ہمارے فیشن کے عاشق فل بوٹ کا انتخاب
کریں گے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ یہ انگریزوں کا پہناوا ہے، ہمارے
پاس اپنی پُرانی ہر چیز کے اچھے ہونے کا ثبوت موجود ہے، اُن
کے پاس صرف ایک جواب ہے کہ یورپ والے ایسا ہی پہنتے ہیں،
اور بھئی ہے بھی یہی بات، قسمت نے ہم کو انگریزوں کا ماتحت
کر دیا ہے۔ ان کی ہر چیز ہمارے لیے قابل تقلید ہے، اور اُن کا
ہر فعل ہمارے لیے چراغ ہدایت۔ اب افعال سے گذر کر اقوال پر
نوبت آ گئی ہے، پادری کرزن تھوڑے ہی دن ہوئے فرما چکے
ہیں کہ ہندوستانی سچ چھوڑو، اور انگریزی سچ بولا کرو۔ آج
ہمارے پادری لیفرائے بھی اُن کے ہمنوا ہوئے ہیں یا تو انھوں نے
یہ سمجھا ہے کہ یہاں کے سچ اور یورپ کے سچ میں فرق ہے اور وقت
آ گیا ہے کہ پیجامے کی طرح ہندوستانی سچ کو اُتار پھینک دیا جائے
اور پتلون کی طرح ولایتی سچ پہن لیا جائے یا اُن کا یہ خیال ہے کہ
ہندوستان کے کسی مذہب نے سچ کی تلقین ہی نہیں کی ہے اور
نیا مال دساور ہو کر ولایت سے آیا ہے۔ بہر حال کچھ بھی ہو، اب
تمھارے پُرانے سچ کی قدر نہیں رہی ہے۔ خدا کے لیے اگر اپنا بھلا
چاہتے ہو تو ان لاٹ صاحبوں کا حکم مانو۔ یہ بڑے لوگ ہیں، مولوی
نذیر حسین یا پنڈت بانکے لال نہیں ہیں کہ اُنھوں نے ہندوستانی
سچ بولنے کی ہدایت کی اور تم نے سن کر ٹال دیا، لاٹ صاحبوں
کی بات نہ مانو گے اور ولایتی سچ نہ بولو گے اور یہ تازہ مال استعمال
نہ کرو گے تو یاد رکھو کہ نوکری ملنی مشکل ہو جائے گی، اور نوکری نہ ملی

نو روٹیوں کو محتاج ہوجاؤ گے ۔کیونکہ دونوں لاٹ صاحبوں نے یہ ہدایت نہیں کی ہے کہ نوکری کا خبط چھوڑو اور تجارت یا صنعت و حرفت اختیار کرو۔ اسی سے تمہارے دلدّر دور ہوں گے۔"

آخر میں مولوی صاحب نے تھوڑا بہت لارڈ لیفرائے کا شکریہ بھی ادا کر دیا لاٹ صاحب اُردو بہت اچھی جانتے تھے۔ مولوی صاحب کی اس پُر مذاق تقریر پر مسکراتے رہے، مگر دل کا خدا ہی مالک تھا۔ کالج کے منتظمین کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ مگر یہاں "تیراز کمان جستہ" کی صورت تھی۔ کیا کرسکتے تھے۔ البتہ دل میں انھوں نے ٹھان لی ہوگی کہ آیندہ مولوی صاحب کو شکریہ ادا کرنے کی تکلیف نہ دینا ہی مناسب ہے۔

اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد میں حیدرآباد چلا آیا۔ پھر دو دفعہ دہلی میں مولوی صاحب سے میرا ملنا ہوا۔ پہلی دفعہ جو ملا تو یہ وہ زمانہ تھا کہ امہات الامّہ کی وجہ سے مولوی صاحب پر بڑی لے دے ہورہی تھی۔ میں نے بھی اس کا ذکر چھیڑا۔ کہنے لگے "بھئی مجھے تو اِس کتاب میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس کی وجہ سے لوگ اس طرح برانگیختہ ہوجائیں۔ تم نے بھی یہ کتاب دیکھی ہوگی۔ آخر تم ہی بتاؤ کہ اس میں میں نے کونسی ایسی بات لکھی ہے" میں نے خود اُمہات الامّہ نہیں دیکھی تھی، مگر میں مولوی صاحب کے طرزِ تحریر سے واقف تھا اس لیے میں نے یہی کہا کہ: "مولوی صاحب آپ کا طرزِ تحریر مذاق کا پہلو لیے ہوئے ہوتا ہے وہ کچھ قصّہ کہانیوں ہی میں مزا دیتا ہے۔ تاریخ کی

کتابوں اور خاص کر مذہبی معاملات میں وہ کسی طرح کھپ نہیں سکتا۔ اگر لوگوں کو اعتراض ہوگا تو آپ کی طرز تحریر ہی کے متعلق ہوگا۔" مولوی صاحب نے کہا "میرے کلام مجید کے ترجمہ کے متعلق تو یہ اُدھم نہیں مچا"۔ میں نے کہا اس پر بھی لوگوں کو اعتراض ہیں۔ مگر اُس میں آپ کا معاملہ اللہ میاں سے ہے۔ اور یہاں انسانوں سے، مشہور مقولہ ہے کہ "باخدا دیوانہ باشں و با محمدؐ ہوشیار"۔ یہ کچھ سوچتے رہے پھر کہنے لگے "ہاں بیٹا کہتے تو سچ ہو، اس قسم کی تالیفات میرے دائرہ تحریر سے باہر ہیں۔ انشاء اللہ دوسرے ایڈیشن میں اس نقص کو رفع کردوں گا۔"

جب میں چلنے لگا تو فرمایا "کہو بیٹا! پھر ملوگے۔ ابھی تو تمھارے جانے میں بہت دن ہیں۔" میں نے کہا "انشاء اللہ ضرور آؤں گا"۔ ہنس کر کہنے لگے "انشاء اللہ کہنے کے بعد تم ضرور آئے۔ مسلمانوں کو جب کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو ہزاروں قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ یہ کام میں ضرور کروں گا۔ مگر جب کسی کام کے کرنے کو جی نہیں چاہتا تو ہمیشہ یہی کہا کرتے ہیں کہ انشاء اللہ ضرور کروں گا۔" ہم تو اس کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ اس کام کے کرنے کا تو ارادہ نہیں ہے، ہاں اگر خدا نے چاہا اور زبردستی یہ کام کرادیا تو مجبوراً کرلیں گے۔" میں نے کہا "مولوی صاحب آپ کو "انشاء اللہ" کے یہ معنی پہنانے مناسب نہیں ہیں۔ آپ مذاقیہ پہلو مذہبی معاملات میں بھی نہیں چھوڑتے"۔ کہنے لگے "میاں۔ پہلے "انشاء اللہ" کے معنی دوسرے تھے؛ آج کل کے مسلمان وہی معنی لیتے ہیں جو میں نے بیان کیے۔"

خدا کی قدرت دیکھو کہ اُسی رات کو عین میرے پلنگ کے نیچے طاعون کا چوہا مرا، اور صبح ہی کے میل سے میں ایسا دہلی سے بھاگا کہ حیدرآباد آکر دم لیا۔

دوسری دفعہ جو میں ملا تو مولوی صاحب کی صحت جواب دے چکی تھی۔ چھت پر جو چھوٹا کمرہ تھا اُس میں آرہے تھے، رعشہ میں اضافہ ہوگیا تھا۔ آنکھوں سے بھی کم دکھائی دیتا تھا، پلنگ پر بیٹھے رہا کرتے تھے۔ میں نے کمرے کے دروازے میں قدم رکھتے ہی بڑی زور سے سلام کیا۔ کہنے لگے "ہیں یہ کون صاحب ہیں؟" میں نے کہا "میں ہوں" پھر پوچھا "آخر میں کون صاحب ہوئے، نام کیوں نہیں بتاتے۔ ارے بھئی اب مجھے صاف نہیں دکھائی دیتا۔ ذرا قریب آؤ" میں نے کہا "واہ مولوی صاحب واہ۔ اگر آواز سے نہیں پہچانا تو خوب پہچانا، دُور سے پہچانیے تو بات ہے" ایک دفعہ ہی ہنس پڑے اور کہنے لگے "او ہو، میاں فرحت ہیں، بھلا اور کون یہ بے تکی باتیں کرے گا۔ آؤ بیٹا۔ اب کے تو کئی برس کے بعد آئے، میں پاس گیا۔ گلے لگایا۔ حالات پوچھتے رہے۔ باتیں کرتے کرتے کہا "ذرا دیکھنا بھئی گھڑی میں کیا بجا ہے" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا کہ "ساڑھے نو میں پانچ منٹ ہیں" کہنے لگے "او ہو، دیر ہوگئی، ذرا میرا جوتہ اور جرابیں تو لے آؤ" میں نے لاکر جرابیں پہنائیں، جوتہ سوکھ کر لکڑی ہوگیا تھا، وہ زبردستی پانوں میں ٹھونسا۔ جوتہ پہن کھڑے ہوگئے۔ میں نے کھونٹی پر سے اُتار کر شیروانی اور ٹوپی دی۔ وہ پہن کر کہنے لگے "چلو بھئی وقت تنگ ہوگیا ہے"

میں نے کہا "مولوی صاحب آخر کہاں جانا ہے" کہنے لگے "بیٹا! آج ایک مقدمہ کی پیشی ہے، وہاں جا رہا ہوں، ذرا مجھ کو کشمیری دروازہ تک تو لے چل" میرا ہاتھ پکڑ کر نیچے اُترے باہر دیکھوں تو کوئی سواری نہیں، میں نے کہا "مولوی صاحب خدا کے لیے اب اس عمر میں تو اس طرح پیدل نہ پھرا کیجیے، خدا نے سب کچھ دے رکھا ہے، آخر یہ کس دن کے لیے ہے، روپیہ اسی لیے ہوتا ہے کہ خرچ کیا جائے، بال بچّوں کی طرف سے بھی بے فکری ہے۔ پھر کیوں اس بڑھاپے میں آپ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں، ذرا اپنی حالت کو دیکھیے اور کشمیری دروازہ کو دیکھیے، یہ دو میل جانا اور دو میل آنا آپ کو مضمحل کر دے گا، ذرا ٹھہر جائیے، میں گاڑی لے آتا ہوں" بہت بگڑے اور کہنے لگے "تجھ کو میرے معاملہ میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اب چلتا ہے تو چل نہیں تو میں کسی اور کو بلاتا ہوں، ابھی میرے ہاتھ پاؤں نے ایسا جواب نہیں دیا ہے کہ کشمیری دروازہ تک نہ جا سکوں" میں نے کہا "مولوی صاحب خدا کے لیے اب تو گاڑی رکھ لیجیے، اگر آپ خرچ نہیں اُٹھاتے تو میں اٹھاؤں گا" ہنس کر کہنے لگے "کیوں نہ ہو روپیہ اُچھلنے لگا ہے، کیا میرے پاس اتنا روپیہ نہیں ہے کہ گاڑی نہ رکھ سکوں بیٹا بات یہ ہے کہ پہلے تو میں نے اس لیے گاڑی گھوڑا نہیں رکھا کہ سائیسوں سے ڈر لگتا تھا۔ ایک تو دانہ گھاس چُراتے ہیں، دوسرے گھوڑے کی مالش نہیں کرتے، تیسرے گاڑی کا آج یہ توڑا کل وہ توڑا، کون بیٹھے بٹھائے اپنی بھلی

چنگی جان کو یہ عذاب لگائے اور دن رات کا فکر مول لے۔ رفتہ رفتہ پیدل پھرنے کی عادت ہوگئی۔ اب آخری عمر میں گاڑی کی ضرورت ہوئی تو گاڑی رکھتے ہوئے شرم آتی ہے لوگ کیا کہیں گے کہ تمام عمر تو مولوی صاحب جوتیاں چٹخاتے پھرے، اب بڑھاپے میں گاڑی پر سوار ہوکر پھرتے ہیں۔ بھئی اب گاڑی رکھنا وضعداری کے خلاف ہے۔" میں نے کہا "تو کمیشن ہی جاری کرا لیا ہوتا" کہنے لگے "وہ بھی میری وضعداری کے خلاف ہے، ہمیشہ کچہری میں جاکر گواہی دی، اب بڑھاپے میں اس وضعداری کو کیوں چھوڑوں۔"

بہرحال یہی بحثیں کرتے کرتے کچہری پہنچ گئے۔ ڈپٹی صاحب کو اطلاع ہوئی انھوں نے مولوی صاحب کو اپنے کمرے میں بٹھایا اور سب سے پہلے اُن ہی کا مقدمہ لے کر اُن کی شہادت قلم بند کی، اور یہ جس طرح گئے تھے اُسی طرح ہانپتے کانپتے میرا ہاتھ پکڑ کر گھر آئے۔

حیدرآباد آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد معلوم ہوا کہ اُس چہکتے ہوئے بلبل نے اس گلشن دنیا سے کوچ کیا۔ جب کبھی دہلی جاتا ہوں تو مولوی صاحب کے مکان پر ضرور جاتا ہوں، اندر قدم نہیں رکھتا مگر باہر بڑی دیر تک دیوار سے لگ کر دروازے کو دیکھا کرتا ہوں، اور رہ رہ کر ذوق کا یہ شعر زبان پر آتا ہے ؎

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور سارے جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

اللہ بس باقی ہوس

خوش مذاقی

ادب اردو میں جہاں اور بہت سی باتیں ناپید ہیں اس قسم کی ظرافت بھی جسے انگریزی میں (Light Humour) کہتے ہیں اور جس کا ترجمہ ہم نے "خوش مذاقی" مناسب سمجھا ہے بالکل مفقود ہے۔ "خوش مذاقی" کی تعریف بہت مشکل چیز ہے۔ البتہ اس کے مفہوم کو اس طرح سمجھا سکتے ہیں کہ آپ ایک معمولی سا مضمون لکھیں اس سرخی سے "ایک روپیہ کی سرگذشت" اور اس کو اس طرح لکھیں کہ پڑھنے والے یہ بھی مانتے جائیں کہ آپ نے ٹھیک لکھا ہے اور ہنستے بھی جائیں، ہنسی کے یہ معنی نہیں کہ آدمی قہقہہ کا بم ہی اڑائے، یا کھل کھلا کر بندوقوں کی باڑ سی ہی داغ دے، ہنسی ایک ذہنی کیفیت ہے ایک طرح کی بشاشت یا زیادہ صحت کے ساتھ یوں کہیے ایک نفسی انبساط ہے اگر دل و دماغ پر ایک انبساط کی کیفیت چھا جائے اور کبھی کبھی لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل جائے اور ایک آدھ دفعہ قارئین پھول کی طرح

کھلکھلا کر ہنس پڑیں تو ایسا مضمون "خوش مذاقی" کا بہترین نمونہ ہوگا "خوش مذاقی" کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رکاکت اور سوقیانہ پن بالکل نہ ہو، اور منطقی پینترے اور داؤں پیچ ذہن کے لیے پُر لطف ورزش بھی ہو جائیں بہر حال اس نوٹ میں "خوش مذاقی" کے زیادہ تجزیہ کی گنجائش نہیں، یہاں ہمیں اپنے معزز قارئین کی خدمت میں اتنا عرض کرنا ہے کہ قارئین کرام کی خاطر اور اردو ادب میں "خوش مذاقی" کی کمی کے مدِ نظر ہم اس ٹوہ میں تھے کہ کوئی اس قسم کا نفیس اور گدگدانے والا صاحب قلم ہاتھ لگے۔ ہماری نظر ایک صاحب پر تھی، لیکن کچھ تو طبعی کاہلی وجودی اور بہت کچھ عدیم الفرصتی کی وجہ سے ان کو لکھنے پر آمادہ کرنا جوئے شیر لانا تو نہیں ہاں کسی نو دریافت محبوبہ کے رام کرنے سے کم نہ تھا۔ انھیں کے قلم کی ستم ظریفی ہے اور انھوں نے اس کو پسند فرمایا کہ "مرزا الم نشرح[1]" کے نام کے پردے میں اپنے آپ کو مخفی رکھیں، ہمیں امید ہے کہ ہمارے قارئین "اس الم نشرح" اخفا کا خیال نہ فرمائیں گے۔ ایسی صورت میں "مرزا الم نشرح کی لطیف تحریر اور لطیف سنج طبیعت اُن کو محظوظ کرتی ہے۔ ہماری نظر میں اُن کا مضمون ایک نواب صاحب کی ڈائری کے چند پراگندہ صفحے"، جو قارئین کے ملاحظہ میں پیش ہیں اور اسی قبیل کے مضامین جو آئندہ ہدیۂ ناظرین ہوں گے "خوش مذاقی"

---

[1] میں نے اپنے چند ابتدائی مضمون "مرزا الم نشرح" بن کر لکھے ہیں۔

کی اُن خصوصیات سے سجے اور سنورے ہوئے پائے جائیں گے جن کا
ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ مطالعہ کے بعد ہمیں یقین ہے کہ یہ بات
آپ پر خود "الم نشرح" ہو جائے گی فقط

محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی اے

ایک نواب صاحب کی ڈائری

کے

چند پراگندہ صفحے

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب
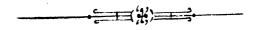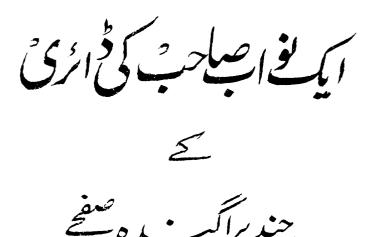
السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ عرصہ سے فکر میں تھا کہ رسالہ نمایش کے لیے کوئی مضمون لکھوں، مگر اس کے لیے فرصت چاہیے۔ مجھے دفتر سے چھٹکارا نہیں۔ چند روز ہوئے پیارے لال پنساری کے ہاں سے گھر میں کچھ سودا آیا تھا میں دفتر سے آکر لیٹا تھا، پڑیوں پر نظر پڑی، اُٹھاکر دیکھنے لگا۔ معلوم ہوا کہ کسی کی سوانح عمری کے صفحات ہیں۔ مضمون دلچسپ اور خط صاف تھا، تمام پڑیاں کھول ڈالیں، دیکھوں تو عجب پُرلطف واقعات ہیں۔ اُسی وقت پیارے لال کے ہاں پہنچا۔ وہاں اور بھی چند کاغذات ملے، مگر سب متفرق و پریشان۔

جو کچھ ملا ہے اس کی نقل روانہ کرتا ہوں۔ میں محنت سے بچا اور آپ کو ایک دلچسپ مضمون مل گیا۔ لیکن افسوس اس کا ہے کہ ڈائری کا مکمل نسخہ نہ ملا اور نہ اب ملنے کی اُمید ہو سکتی ہے۔ خیر حاضر میں حجت نہیں۔

والسّلام

(مرزا الم نشرح)

دیباچۂ ڈائری

یہ ناچیز خادم ملک و ملت نواب اسد یار خاں ناظرین کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ اس کمتربن کو کتوں سے ہمیشہ نفرت رہی ہے اور رہنی بھی چاہیے۔ کیونکہ جب باری تعالیٰ نے ان ناپاک ہستیوں کو نجس العین فرمایا ہے تو انسان ضعیف الیقیان کی کیا ہستی ہے کہ ان احکام کی خلاف ورزی کرے، اور جب ہمارے ہادیِ برحق نے کتوں سے کنارہ کرنے کی ہدایت فرمائی ہے تو اب کس کی مجال ہے کہ اُن ہدایتوں پر عمل کرنے سے گریز کرے۔

اکثر اصحاب اس ناچیز سے دریافت فرماتے ہیں کہ آخر کتوں سے نفرت کرنے کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب پہلے تو میں شیکسپیئر کے اس فقرے سے دیتا ہوں کہ "جذبات انسانی طبیعت کے تابع ہیں، طبیعت اپنے حسبِ دلخواہ ان جذبات کو نفرت یا رغبت جس طرف چاہے پھیر دیتی ہے" دوسرے میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ میرے خیالِ ناقص میں کتوں کا ہلاک کرنا کارِ ثواب ہے۔ ثواب ہی نہیں بلکہ جہاد، اور جہاد بھی کیسا کہ جہاد اکبر، یہ تو سب جانتے ہیں کہ کافر نجس ہیں، نجس العین نہیں، اور یہ بھی ثابت ہے کہ کتے نجس العین ہیں، جب نجس کو ہلاک کرنا جہاد ہے تو نجس العین کو مارنا یقیناً جہاد سے بھی کچھ افضل ہے۔ یہی خیالات تھے جس کی وجہ سے میں کتوں کا

جانی دشمن ہوگیا۔ جہاں پاتا، مارتا، اور جہاں دیکھتا کم سے کم دو لاتیں تو ضرور رسید کر دیتا۔ البتہ بعض کتے بڑے زبردست اور خوفناک ہوتے ہیں، ایسی صورت میں چونکہ اپنی جان کی حفاظت فرض ہے اس لیے ذرا احتیاط کو کام میں لاتا۔ کبھی کچلہ سے کبھی کسی طرح ان کو ٹھکانے لگاتا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری محنت مشکور ہوئی اور میری اس سرگرمی کی یہ داد ملی کہ پبلک نے مجھے "غازی" کے بجائے "نواب کتے مار خاں" کا خطاب دیا۔ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔

جو جو مشکلات اور مقابلے مجھے اس جہاد میں پیش آئے ان کو میں نے اپنی ڈائری سے لے کر ایک جگہ جمع کیا اور اُس کا نام "فتوح الکلاب" رکھا ؎

نوشتہ بماند سیہ بر سفید نویسندہ را نیست فردا امید

اُمید ہے کہ قارئین کرام ان حالات کو پڑھ کر فائدہ اُٹھائیں گے، اگر میری اس تحریر نے بعض اصحاب کے دل میں کتوں سے نفرت پیدا کر دی، اور وہ میری طرح کتوں کو مارنے میں ہر مشکل کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو گئے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی ؎

نصیحت کہ سودمند آیدش کہ گفتار سعدی پسند آیدش

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

خاکسار نواب کتے مار خاں

نوٹ:۔ اس کے بعد کے چند صفحات غائب ہیں۔

کتا بیٹھ میں مکان ملا۔ سامنے ہی ایک نواب صاحب رہتے تھے۔ اُن کا بڑا کارخانہ تھا۔ میری شومئ قسمت (یا خوش قسمتی سے) ایک بڑا زبردست کتا بھی اُن کے ہاں پلا ہوا تھا۔ جب دیکھو دروازے کے باہر بیٹھا ہے، اور ہر آنے جانے والے پر بھونکتا ہے ظاہر ہے کہ اس کا مارنا مجھ پر فرض ہو گیا۔ آمنے سامنے کے مقابلہ کی تو ہمت نہ پڑی۔ ہاں یہ ترکیب اختیار کی کہ جب اُدھر سے گزرتا کوئی نہ کوئی چیز اُس کے کھانے کو ڈال دیتا۔ اس کو بھی کھانے کا چسکا پڑ گیا اور چند دنوں میں مجھ سے کسی قدر مانوس ہو گیا۔ آخر ایک دن دہی میں کچلا دے کر اس کو جہنم واصل کر دیا۔

نواب صاحب کو خبر ہوئی وہ میرے خطاب اور حالات سے واقف تھے۔ مگر ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے میرا کچھ بگاڑ نہ سکتے تھے۔ اس لیے خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو گئے۔ چلو گئی گذری بات ہوئی۔

ایک روز میں باہر گیا ہوا تھا۔ کوئی دس گیارہ بجے جو واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے دروازے کے سامنے کتوں کا جمگھٹا ہے اور میونسپلٹی کا چپراسی ایک ٹوکری بغل میں مارے کتوں کو گوشت پھینک رہا ہے۔ مجھے بہت بُرا معلوم ہوا۔ بجتا بجاتا یہ چپراسی صاحب کے پاس تک پہنچا اور کہا "بدمعاش یہ تو نے کیا گڑ بڑ مچائی ہے۔ کیا اپنے باوا کی فاتحہ کا کھانا تقسیم کرنے کو میرا ہی دروازہ ملا۔ اب یہاں سے جاتا ہے یا پھر تیری اور طرح خبر لوں"، چپراسی ناک بھوں چڑھا کر بولا "اجی جاؤ جی جاؤ ہم سرکاری حکم کی تعمیل

کر رہے ہیں۔ حکم ہوا ہے کہ روز دس سیر گوشت اس جگہ کتّوں کو ڈالا جائے۔ سرکاری سڑک ہے۔ ایسا ہی بُرا معلوم ہوتا ہے تو جا کر ہمارے نام نالش کر دو۔" گوشت کی بو پا کر اِدھر اُدھر سے کتّے ٹوٹ پڑے اور تھوڑی دیر میں ہزاروں کا مجمع ہو گیا۔ راستہ بند، گھر میں جاؤں تو کس طرح جاؤں اتنی ہمّت نہ ہوتی تھی کہ ایسی بڑی فوج کو چیر پھاڑ کر گزر جاؤں، آخر سوچتے سوچتے یہ سوجھی کہ اس بارہ میں کسی وکیل سے مشورہ کرنا چاہیے۔ اِن دنوں لالہ شیو سیوان لل کی وکالت زوروں پر تھی۔ سیدھا اُن کے پاس پہنچا تمام واقعہ بیان کیا اور کہا کہ نواب بخول خاں پر میری جانب سے استغاثہ دائر کر دیجیے۔ اُنھوں نے کہا کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ کارروائی نواب صاحب ہی نے کی ہے۔ میں نے کہا کہ "ہو نہ ہو یہ اُنھی کی کارستانی ہے وہ میونسپل کمیٹی کے ممبر ہیں اُنھوں ہی نے اس نامعقول چپراسی کو اس لنگر کی تقسیم پر مقرر کیا ہے" وکیل صاحب نے کہا کہ "قیاسات پر کسی کو ملزم نہیں بنایا جا سکتا" میں نے کہا "تو میونسپل کمیٹی کو ملزم بنا دیجیے۔" انھوں نے اس سے بھی انکار کیا تو میں نے جل کر کہا "تو اچھا کتّوں ہی کو ملزمین بنا لیجیے۔"

وکیل صاحب ...... معاف فرمائیے میں کتّوں کو ملزمین بنا کر اپنی وقعت کھونا نہیں چاہتا۔

میں ...... معلوم ہوتا ہے کہ کتّوں میں آپ کی بڑی قدر و منزلت ہے، اور اُن میں اپنی وقعت کم ہونے سے آپ گھبراتے ہیں۔ یا

شاید پہلے جنم میں آپ کتے تھے کہ اپنے سابقہ رشتہ داروں اور دوستوں کے خلاف کوئی کارروائی کرنا نہیں چاہتے۔

وکیل صاحب نے بہت نیلے پیلے ہوکر میری طرف دیکھا مگر سمجھ گئے کہ ہاتھ پاؤں سے مجھ پر قدرت ناممکن ہے۔ اس لیے کہنے لگے "جناب میں نے عدم تعاون کے اصول پر کاربند ہوکر وکالت ترک کر دی ہے۔ آپ کسی دوسرے وکیل کی تلاش کیجیے۔"

یہاں سے کورا جواب مل گیا تو میں نے دل میں کہا کہ چلو خود ہی قانون دیکھ ڈالو۔ انھیں وکیل صاحب میں کیا سرخاب کا پر ہے کہ یہی قانون سمجھتے ہیں دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ راستہ میں آتے آتے تعزیرات ہند اور ضابطہ فوجداری خرید لیا۔ گھر پر پہنچ کر تمام رات میں ان دونوں کتابوں کو دیکھ ڈالا۔ معاملہ کوئی پیچیدہ نہ تھا۔ کتوں کے افعال سے جرم مزاحمت بیجا پورا بنتا تھا۔ چنانچہ دفعہ (۳۳۹) تعزیرات ہند کے تحت استغاثہ مرتب کیا۔ ترتیب استغاثہ کے وقت یہ دقت پیش آئی کہ آخر ملزمین کن کو بنایا جائے۔ قانون پر غور کرنے کے بعد میں نے استغاثہ کا عنوان اس طرح قایم کیا:-

نواب اسدیار خاں المخاطب بہ کتے مار خاں بہادر.... مستغیث

بنام

جمیع سگان خورد و کلاں بازاری (فاترالعقل) بولایت میونسپل کمپنی .... ملزمین

علت

مزاحمت بیجا زیر دفعہ (۳۳۹) تعزیرات ہند

استغاثہ میں تمام واقعات مذکورۂ بالا کی صراحت کرکے استدعا کی گئی تھی کہ چونکہ فاترالعقل ہونے کی وجہ سے کتے مستثنیاتِ عامہ کی دفعہ ۸۴ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے بعد تحقیقات میونسپل کمیٹی کے خلاف سزا ِ قانونی صادر فرمائی جائے۔

استغاثہ مرتب کرکے دوسرے دن ڈپٹی کلب علی خاں صاحب مجسٹریٹ ضلع کے اجلاس پر داخل کردیا۔ میرے حلفی بیان کے بعد عدالت سے میونسپل کمیٹی کے نام سمن جاری ہوئے اور تاریخ پیشی پر مقدمہ پیش ہوا۔ میونسپل کمیٹی کی جانب سے مسٹر کولی بیرسٹرایٹ لا کونسل تھے۔ اپنی طرف سے میں نے خود پیروی کی۔

سب سے پہلے کونسل ملزمین نے یہ بحث چھیڑی کہ میونسپل کمیٹی کتوں کی ولیہ نہیں ہوسکتی۔ دوسرے یہ کہ کتوں کے فاترالعقل ہونے کی کوئی شہادت یا ثبوت نہیں ہے مجسٹریٹ صاحب نے میری طرف دیکھا۔ میں ان مباحث کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا۔ میں نے بحث کی کہ میرے فاضل دوست نے اپنی بحث کی ابتدا ہی غلط کی ہے کہ پہلے ولایت کا مسئلہ چھیڑا ہے اور بعد میں کتوں کے فاترالعقل ہونے کا ثبوت طلب کیا ہے۔ چاہیے یہ تھا کہ پہلے کتوں کے فاترالعقل ہونے پر بحث کی جاتی اگر وہ فاترالعقل قرار پاتے تو اُس صورت میں ولایت سے بحث کی جاتی۔

بہرحال پہلے میں اپنے فاضل دوست سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کتوں کے فاترالعقل تسلیم کرنے میں کیوں تأمل ہے۔

مسٹر کولی ۔ میں بغیر ثبوت کے کسی چیز کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

ڈپٹی صاحب ۔ میرے خیال میں بعض کتے اپنے مالکوں سے زیادہ ہوشیار اور سمجھ دار ہوتے ہیں۔

مسٹر کولی ۔ جناب والا صحیح ارشاد فرماتے ہیں، خود میرا کتا ٹولی ایسا ہی ہے۔

میں ۔ ممکن ہے کہ مسٹر کولی کا کتا خود ان سے زیادہ ہوشیار اور سمجھ دار ہو۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ کتے فاتر العقل نہیں ہوتے ہاں اگر منطقی نتیجہ نکل سکتا ہے تو یہ نکل سکتا ہے کہ مسٹر کولی کتوں سے بھی زیادہ فاتر العقل ہیں۔

مسٹر کولی ۔ جناب والا میں ان الفاظ کی برداشت نہیں کر سکتا۔

میں ۔ حضور اس مسئلہ کا صغریٰ اور کبریٰ خود مسٹر کولی نے قایم کیا ہے۔ میں نے تو صرف اس کی بنا پر نتیجہ کا اظہار کیا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ مسٹر کولی کتوں سے زیادہ بیوقوف ہیں۔ اُنھوں نے خود اپنی عقل کا معیار ظاہر کیا۔ تعجب ہے کہ اسی کے دُہرانے کو یہ اپنی توہین خیال فرماتے ہیں۔

نوٹ :۔ یہ کچھ عجب اتفاق ہے کہ ہمارے نواب صاحب کو مکان ملا تو کتا بیٹھ میں، مد مقابل ملے تو بجول خاں، بیرسٹر ملے تو مسٹر کولی، ڈپٹی صاحب ملے تو کلب علی خاں اور وکیل صاحب ملے تو شیو سیوان لال غرض کتوں کے تلازمہ سے کہیں نجات نہیں ملی۔ ع اتفاقات ہیں زمانے کے

ڈپٹی صاحب - اچھا اب آپ اپنی بحث کی طرف رجوع کیجیے۔
میں - جناب والا کسی کے عاقل یا فاترالعقل ہونے کا اندازہ اُس کے افعال سے لگایا جاتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ کتے بازاروں میں کھڑے ہڈیاں چباتے ہیں اور ان کو اپنے اس فعل پر شرم تک نہیں آتی تو اُن کو فاترالعقل کہنے میں کون امر مانع ہو سکتا ہے کیونکہ خود اُن کے افعال اُن کے فاترالعقل ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔
مسٹر کولی - میرے خیال میں اُن کا اس طرح ہڈیاں چبانا اُن کے فاترالعقل ہونے کا ثبوت قطعی نہیں ہے۔
میں - اگر میرے فاضل دوست سڑک پر کھڑے ہوکر ہڈیاں چبانے لگیں اور کوئی ان کو فاترالعقل نہ کہے تو میں کتوں کو بھی فاترالعقل کے زمرہ سے نکال دینے پر بالکل تیار ہوں۔
مسٹر کولی - میں معزز عدالت کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ مستغیث نے جو الفاظ میری نسبت استعمال کیے ہیں وہ میری توہین کی حد تک پہنچتے ہیں۔
میں - جناب والا میرے فاضل دوست نے ثبوت طلب کیا۔ میں نے منطق سے اس کا جواب دیا۔ اگر یہ میرے اعتراض کا عملی ثبوت دینے پر تیار نہیں ہیں تو یہ کتوں کو فاترالعقل تسلیم کریں۔ چلو چھٹی ہوئی نہ مجھ کو حجت نہ اُن کو شکایت۔
ڈپٹی صاحب - بہتر ہوگا کہ آپ اس قسم کی تمثیلات سے پرہیز کریں۔
میں - جناب والا - قانون ہمیشہ تمثیلات سے اچھی طرح سمجھا جاتا ہے۔

اگر تمثیلات سے جناب کو ایسی ہی نفرت ہے تو مناسب ہوگا کہ قانون سے ان کو خارج کر دینے کی تحریک فرما دیجائے۔

ڈپٹی صاحب ۔ آپ خیال رکھیں کہ یہ گفتگو آپ کہاں کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کے الفاظ کی بناء پر تحقیر عدالت کا مقدمہ آپ پر قایم ہو جائے۔

میں ۔ حضور والا کی تقریر سے خود میری حجت کی تائید ہوتی ہے۔ عدالت کوئی عاقل شے نہیں ہے۔ جس کی تحقیر ہو سکے ۔ اگر خدانخواستہ تحقیر ہوگی تو جناب والا کی، اور اگر مقدمہ قایم ہوگا تو اس عنوان سے قایم ہو سکے گا کہ :-

"عدالت (فاترالعقل) بولایت صاحب مجسٹریٹ بہادر مستغیث"

ڈپٹی صاحب ۔ آپ اپنی بحث میں احتیاط کیجیے اور آگے چلیے۔

میں ۔ دوسری بحث فریق مخالف کی جانب سے یہ کی جاتی ہے کہ میونسپل کمیٹی کتوں کی ولیۃ نہیں ہے۔ میں اس کا جواب میونسپل کمیٹی کے ضابطہ سے دینا چاہتا ہوں ۔ میرے فاضل دوست اس امر کو تسلیم کریں گے کہ تمام رعایا کے مکانات سے میونسپل کمیٹی ٹیکس وصول کرتی ہے لیکن جو جائداد میونسپل کمیٹی کی ہے اُس پر ہوس ٹیکس نہیں لیا جاتا اصول یہ ہوا کہ میونسپل کمیٹی کی جو چیز ہے وہ ٹیکس سے مستثنیٰ ہے اب اس کا عکس ملاحظہ کیجیے۔ رعایا کے کتوں پر میونسپل کمیٹی ٹیکس لیتی ہے۔ لیکن بازاری کتوں پر کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ جنگلی کتے میونسپل کمیٹی کی ملک ہیں — چونکہ (جیسا کہ میں اوپر ظاہر کر آیا ہوں) یہ کتے

فاتر العقل ہیں اس لیے اُن کا مالک و قابض یعنی میونسپل کمیٹی ان کی ولیہ جائز ہے۔

مسٹر کولی۔ میں معزز عدالت سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میرے دوست کے ان فقروں سے میرے موکلین کی توہین ہوتی ہے۔

میں۔ میں اپنے فاضل دوست سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اُن کے موکل کتے ہیں یا میونسپل کمیٹی؟ اس صراحت کی مجھے اس لیے ضرورت ہوتی ہے کہ مستغیث کی نگاہ میں بحیثیت ملزمین اس مقدمہ میں کتوں اور میونسپل کمیٹی میں کوئی فرق نہیں ہے۔

مسٹر کولی۔ میں معزز عدالت کو پھر توجہ دلاتا ہوں کہ یہ دوسرے پہلو سے میرے موکلین پر حملہ کیا جا رہا ہے۔

میں۔ میرے فاضل دوست نے میرے سوال کا جواب عنایت نہیں فرمایا۔

مسٹر کولی۔ میں میونسپل کمیٹی کی طرف سے پیروی کر رہا ہوں۔

میں۔ جب مسٹر کولی کتوں کی طرف سے کونسل نہیں ہیں اور یہ میونسپل کمیٹی کو کتوں کی ولیہ بھی تسلیم نہیں کرتے تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ کونسے قاعدہ کی رو سے کتوں کی طرف سے بحث کر رہے ہیں ان کو چاہیے تھا کہ اپنے موکل کا نام زمرہ ملزمین سے خارج کرانے کی کوشش کرتے۔ میں جانتا اور بقیہ ملزمین، ہم خود آپس میں بھگت لیتے۔ بحالت موجودہ میونسپل کمیٹی نے جو ایک بیرسٹر مقرر کرکے رعایا کا روپیہ برباد کیا ہے اس کے متعلق میں عدالت سے نہایت ادب کے ساتھ درخواست کروں گا کہ مجھے رعایا کی جانب سے

میونسپل کمیٹی پر خیانت مجرمانہ زیر دفعہ (۴۰۹) تعزیرات ہند مقدمہ دائر کرنے کی اجازت دی جائے۔

ڈپٹی صاحب ۔ آپ صرف اپنے مقدمہ سے سروکار رکھیے۔

مسٹر کولی ۔ میں مستغیث کے ان مباحث قانونی کا کوئی جواب دے کر عدالت کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ معزز عدالت خود ان کی وقعت پر غور کر کے فیصلہ صادر فرما سکتی ہے۔ مجھے صرف ایک قانونی بحث اور کرنی رہ گئی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تعزیرات ہند میں صرف افعال اشخاص سے بحث کی گئی ہے۔ جانوروں کے افعال اس میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اگر میں تسلیم کر لوں کہ چند کتے مستغیث کے دروازہ کے سامنے جمع ہوئے اور بفرض محال ان کے سدراہ بھی ہوئے تو ان کے افعال ان کو مزاحمت بےجا کے جرم کے تحت میں نہیں لا سکتے۔

میں ۔ میں اپنے فاضل دوست کی اس بحث کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تعزیرات ہند کو نہایت سرسری نظر سے دیکھا ہے۔ میں ان سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا میونسپل کمیٹی قانوناً "شخص" کی تعریف میں داخل ہو سکتی ہے؟

مسٹر کولی ۔ ہو سکتی ہے۔

میں ۔ یہ کیونکر؟

مسٹر کولی ۔ کیونکہ چند میونسپل کمشنروں کے مجموعہ کا نام میونسپل کمیٹی ہے۔ اس وجہ سے لفظ "شخص" کا اطلاق قانوناً اس پر ہو سکتا ہے۔

میں - میرے فاضل دوست نے خود اپنے اس جواب سے اپنے اعتراض کو رفع کر دیا جب چند جانداروں کے مجموعہ پر لفظ "شخص" کا اطلاق ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ کتوں کا مجموعہ "شخص" کے تحت میں کیوں نہ آئے اور جب کتوں کا مجموعہ لفظ "شخص" سے قانوناً تعبیر کیا جا سکتا ہے تو جو افعال اس کتوں کے مجموعہ سے سرزد ہوئے ہیں ان سے تعزیرات ہند کے کیوں متعلق نہ ہو جائیں گے۔

مسٹر کولی - میں اس بحث کے سمجھنے سے قاصر ہوں۔

میں - مجھے آپ کے دماغ سے یہی امید تھی۔ کیا اچھا ہوتا اگر آپ کتے کو بھی ساتھ لے آتے۔ شاید دونوں مل کر اس بحث کو سمجھ لیتے۔

ڈپٹی صاحب - اچھا آگے چلیے۔

میں - اب رہی یہ بحث کہ کتوں کا سدِراہ ہونا مزاحمت بیجا ہو سکتا ہے یا نہیں تو میں اس کے متعلق نہایت زور سے کہوں گا کہ ہو سکتا ہے اور ضرور ہو سکتا ہے۔ میں اپنی اس بحث کو ایک تمثیل سے بہت اچھی طرح ذہن نشین کرا سکتا ہوں، فرض کیجیے ہمارے بیرسٹر صاحب اپنے مکان میں داخل ہونا چاہتے ہیں اور ہمارے ڈپٹی صاحب ان کے سدِراہ ہوتے ہیں اور اسی کشمکش میں ہمارے فاضل دوست کے دو چار ٹھوکریں بھی پڑ جاتی ہیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا مزاحمت بے جا کا جرم مکمل ہو گیا؟

مسٹر کولی - جرم ضرور ہوا۔ مگر جن الفاظ میں وہ بیان کیا گیا ہے وہ عدالت کی توجہ کا محتاج ہے۔

میں۔ اب بیرسٹر صاحب کے دروازہ پر ڈپٹی صاحب کو کتا سمجھ لیجیے۔ اگر یہ اس کشمکش میں ہمارے فاضل دوست پر بھونکیں اور کاٹ بھی کھائیں تو کیا جرم مزاحمت بیجا مکمل نہیں ہوا؟

مسٹر کولی۔ مفروضات کو قانون میں دخل نہیں ہے۔

میں۔ یہ قانونی مفروضات ہیں۔ میں اوپر ثابت کر آیا ہوں کہ کتے لفظ "شخص" کی تعریف میں قانوناً آ سکتے ہیں، اور آپ یہ تسلیم کریں گے کہ ڈپٹی صاحب بھی قانوناً شخص ہیں۔ اس لیے اپنی بحث میں اگر میں نے یہ فرض کر لیا کہ ڈپٹی صاحب کتے ہیں تو کیا ظلم کیا۔ بہر حال جب ڈپٹی صاحب کا سدِ راہ ہونا جو مسٹر کولی سے کم تعلیم یافتہ ہیں مزاحمت بے جا ہے تو کتوں کا سدِ راہ ہونا بدرجۂ اولیٰ مزاحمت بے جا ہے۔ کیونکہ ہمارے فاضل دوست تسلیم کرتے ہیں کہ بعض کتے ان سے زیادہ سمجھ دار ہوتے ہیں۔

(اس سے آگے کے صفحات غائب ہیں۔)

....

خدا خدا کر کے مکان ملا، مکان گو چھوٹا تھا۔ لیکن میری ضرورت کو کافی تھا۔ گھر میں تھا کون۔ میں، میری بلیاں، اور ایک کھوسٹ ماما۔ دیوار بیچ مولوی قطمیر صاحب کا مکان تھا۔ بیچارے بڑے بھلے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ مجھ سے آ کر ملے حالات دریافت کیے باتوں باتوں میں کنایۃً بیٹھ کے مکان چھوڑنے کا بھی ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے تمام واقعات بیان کیے۔ کہنے لگے "بھئی معاف کرنا، میرے ہاں بھی ایک کتا پلا ہوا ہے مگر بہت غریب ہے اور میں کوشش کرونگا کہ

وہ آپ کو تکلیف نہ دے۔" کتے کا ذکر سنتے ہی جو وقعت مولوی صاحب کی میرے دل میں قائم ہوئی تھی وہ یک قلم جاتی رہی۔ اس کے بعد میں نے اُن سے کچھ اُکھڑی اُکھڑی باتیں کیں اور وہ کسی قدر کشیدہ خاطر ہوکر میرے پاس سے اُٹھ گئے۔

چار روز تک کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ پانچویں روز میں صحن میں بیٹھا تھا کہ ایک نہایت بدصورت کا لا کتا پیخانہ کی موری سے نکل کر بہت اطمینان سے اندر آیا اور اس طرح ٹہلنے لگا گویا اس کے باوا کا مکان ہے۔ میں نے بہت دُھت دُھت کی اُس نے یہ بھی نہ جانا کہ کون کتا بھونک رہا ہے۔ میں نے فہمن کو پکارا۔ وہ باورچی خانہ سے لکڑی لے کر دوڑی جب کہیں جاکر یہ بلا دفع ہوئی۔ اب مشکل یہ آپڑی کہ پیخانہ کے برابر والی دیوار مولوی قطمیر صاحب کی تھی اور موری بھی انھیں کی تھی۔ موری بند کس طرح کرتا۔ آخر سوچتے سوچتے ایک ترکیب سوجھی کوئی دو من کا پتھر لے کر عین موری کے اُوپر منڈیر کے بالکل کنارہ پر رکھا پتھر میں رسّی باندھی اور موری کے سامنے بیچوں بیچ ایک لمبی سی کیل گاڑ کر اور رسّی کو تان کر اُس کا دوسرا سرا کیل میں باندھ دیا، اور دل میں کہا "لو بیٹا! اب تم آنا کھوپری چورم چور نہ ہو جائے تو میرا نام نواب کتے مار خاں نہیں۔"

وہ دن تو خیر سے گذر گیا، دوسرے صبح ہی کو مولوی صاحب کے کتے نے میرے مکان میں سیرگشت کا ارادہ کیا۔ میں صحن میں بیٹھا اُن کی کارگزاری دیکھ رہا تھا۔ انھوں نے نہایت اطمینان سے موری میں سر ڈالا، سر رسّی سے ٹکرایا۔ اِدھر انھوں نے زور کیا،

ادھر پتھر آہستہ آہستہ منڈیر سے کھسکنا شروع ہوا۔ اِدھر یہ کھری سے باہر نکلے اُدھر پتھر اُوپر سے آیا۔ قیں کرکے وہیں ٹھنڈے ہوگئے۔ مولوی صاحب کی بیوی نے جو آواز سُنی تو غل مچایا۔ "ہائے ہائے مولوی صاحب۔ اس حرامزادے نواب نے میرے کُتے کو مار ڈالا۔ خدا اس کو غارت کرے" ایک لمحہ نہ گذرا تھا کہ مولوی صاحب میرے مکان میں آئے اور بغیر سلام علیک کیے سیدھے کھری کے پاس پہنچے کُتے کو پتھر کے نیچے سے نکالا اور اسی طرح چپ چاپ واپس چلے گئے۔ مجھے خیال تھا کہ کچھ گلخپ ہوجائے گی۔ لیکن اُن کے اس تحمل پر مجھے تعجب ہوا اور میں نے دل میں کہا کہ چلو منت میں ایک کتا تو کم ہوا۔ ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

مجھ کو اگر معلوم ہو جاتا کہ مولوی صاحب کا سکون طوفان کی آمد کا پیش خیمہ ہے تو میں پہلے ہی سے گھر چھوڑ کر بھاگ جاتا۔

اس کے بعد بی فہمین کا مولوی صاحب کے ہاں آنا جانا بڑھا۔ جب دیکھو باورچی خانہ خالی پڑا ہے۔ میں نے کہا "بی فہمین اس طرح راہ و رسم بڑھانا اچھا نہیں۔ تمھیں میرے پاس رہنا ہے تو سیدھی طرح رہو ورنہ خدا حافظ۔ تمھیں نوکری کی کمی نہیں اور مجھے نوکروں کا توڑا نہیں"۔ بی فہمین نے کہا "میاں آپ کا کام کاج کرکے دو گھڑی رحمت کی ماں کے پاس جا بیٹھتی ہوں اگر آپ کو یہ ناگوار ہے تو آج سے نہ جایا کروں گی"۔ یہ سُن کر میں چپ ہو رہا۔

دوسرے دن شام کو بی فہمین ہانپتی کانپتی میرے پاس آئیں

اور کہنے لگیں "میاں مجھے بخار چڑھ رہا ہے آپ اجازت دیں تو گھر ہو آؤں۔ کھانا پکا دیا ہے آپ کو تکلیف تو ہوگی۔ اگر آپ کھانا کھا کر سامان باورچی خانہ میں رکھ دیں تو انشاء اللہ میں کل صبح آکر دیکھ لوں گی۔"

میں نے کہا "اس میں کیا حرج ہے۔ جاؤ گھر ہو آؤ۔ مگر کل صبح ضرور آجانا، ورنہ مجھے تکلیف ہوگی" وہ دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی، اور میں نے باہر کے دروازہ کی کنڈی لگالی، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کمبخت بھی مولوی صاحب سے مل گئی تھی۔ بخار کا صرف بہانہ تھا۔ مجھے صرف تنہا مکان میں چھوڑ جانا مقصود تھا۔

خیر تھوڑی دیر بعد میں نے اٹھ کر وضو کیا عشاء کی نماز پڑھی، گرمیوں کا موسم تھا، باہر سنیں پائی ڈالی، باورچی خانہ میں سے کھانا نکال کر لایا۔ منہ میں نوالہ رکھتا ہی چاہتا تھا کہ بیچانہ کی مہری کی طرف سے قیاؤں کی آوازیں آئیں اور ساتھ ہی ایک کالا جگادری کتا صحن میں نازل ہوا۔ میں نے ہش ہش کی۔ مارنے کو لکڑی اٹھائی وہ مہری کی طرف بھاگا۔ لیکن مہری تک نہ پہنچا تھا کہ ایک دوسرا کتا اسی راستہ سے اندر داخل ہوا اس کے بعد تو کتوں کی قطار لگ گئی۔ ایک دو تین چار۔ دس بارہ، بیس پچیس خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کم از کم تین پینتیس کتے اندر گھس آئے۔ تمام صحن بھر گیا۔ ایک کو ماروں دو کو ماروں، آخر کن کن کو ماروں۔ کتوں نے بھی دیکھا کہ ہماری تعداد زیادہ ہے اور یہ شخص کچھ سہما ہوا سا ہے اور بھی اشیر ہو گئے، پہلے مجھ پر غرائے، ادھر کھانے کی بو ناک میں گئی،

ایک دم دسترخوان پر حملہ بول دیا۔ ان کی یورش سے میں پریشان ہوکر بھاگا۔ کتے سمجھے گھر میں ہی ایک غیر جنس ہے مجھ پر پل پڑے مجھ کو اس وقت اور کچھ نہ سُدھرا۔ سامنے پنکھا لٹکا ہوا تھا۔ جست کرکے اُوپر چڑھ گیا۔ ایک کتے نے چڑھتے چڑھتے پانوں پر مُنہ بھی مارا۔ مگر میں جوں توں کسی نہ کسی طرح پنکھے پر جا ہی بیٹھا، اب کیا تھا حرامزادوں کو خوان یغما مل گیا۔ نہایت فراغت سے دسترخوان صاف کردیا۔ اور ہم خون کے گھونٹ پیتے، پنکھے پر بیٹھے رہے، کھانے اور لڑنے سے فراغت پاکر بدمعاشوں نے مکان کے کونہ پر قبضہ کرلیا۔ کوئی کہیں جا بیٹھا۔ کوئی کہیں، دو زبردست کالے کتے عین میرے پنکھے کے نیچے بآرام تمام آکر قالین پر دراز ہوگئے۔

جب ذرا امن ہوا تو میں نے سوچنا شروع کیا کہ اس واردات کی بنا پر ان کتوں اور مولوی قطمیر صاحب پر کیا کیا جرائم عاید ہوسکتے ہیں، تعزیرات ہند پاس نہ تھی لیکن اُس کی دفعات دھیان میں تھیں۔ آخر رائے یہ قرار پائی کہ نقب زنی بلوہ اور ڈاکہ کے جرائم کتوں پر اور اُن جرائم کی اعانت کا الزام مولوی صاحب پر قائم کیا جاسکتا ہے، وہیں بیٹھے بیٹھے استغاثہ کا مضمون بھی دل میں سوچ لیا۔ غرض اسی فکر میں رات کے کوئی بارہ بج گئے۔ نیند کا غلبہ ہوا آنکھیں بند ہونے لگیں اور آخرکار آنکھ لگ گئی، کیا دیکھتا ہوں کہ بلوہ نقب زنی اور ڈاکہ کا مقدمہ ڈپٹی صاحب کے اجلاس پر پیش ہوا، کتوں کو حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی اور مولوی صاحب پر اعانت کا جُرم ثابت قرار پاکر

۶ سال کی قید بامشقت اور دس ہزار روپیہ جرمانہ اور عدم ادائے جرمانہ کی صورت میں مزید تین سال قید بامشقت کی سزا سنادی گئی۔ اور یہ بھی حکم دیا گیا کہ جو جرمانہ وصول ہو اس میں سے حسب دفعہ ۵۴۵ ضابطہ فوجداری نو ہزار روپیے مستغیث کو دیے جائیں۔ یہ سزا مرافعہ میں بحال رہی اور مجھ کو جرمانہ وصول شدہ میں سے نو ہزار روپیہ نقد حسب ضابطہ وصول ہو گئے، اب کیا تھا۔ یار دوستوں نے مبارک باد کی بوچھار کر دی اور تقاضا شروع کیا کہ اس خوشی میں جلسہ کیا جائے۔ خاص باغ میں جلسہ مقرر ہوا ارباب نشاط بلائے گئے، ساون کا مہینہ ہے، امرائی میں جھولا پڑا ہے یہ خاکسار جھولے میں بیٹھا ہے، ننھی جان اور بی حفیظن کھڑی جھولا جھلا رہی ہیں! ملار گائے جا رہے ہیں، کہ ایک دفعہ ہی جھولے کی رسی ٹوٹی اور میں دھم سے نیچے آرہا اور گرنے کے ساتھ ہی دو کتوں نے چیخ ماری۔ آنکھ کھل گئی کیا دیکھتا ہوں تو پنکھے کے نیچے پڑا ہوں، معلوم ہوتا ہے کہ پنکھے سے جو گرا تو سیدھا کتوں کے اوپر۔ ان کو اس بلائے ناگہانی کے نازل ہونے کا کیا خیال تھا۔ ہڈیاں اور پسلیاں چورا ہو گئیں۔ لنگڑاتے اور چیختے ہوئے بھاگے۔ دوسرے کتے بھی گھبرائے۔ ان دونوں زخمیوں نے پہلے دروازہ کا رخ کیا اس کو بند پایا تو سیدھے پیخانہ کی موری کی طرف گئے اور زور کر کے پار ہو گئے، جانوروں میں بھیڑ با چال تو ہوتی ہی ہے۔ سب کے سب یکے بعد دیگرے موری سے نکل کر مولوی صاحب کے گھر میں داخل ہو گئے۔ جب یہ آفت دفع ہوئی تو میں بھی اٹھا کولے میں بہت چوٹ آئی

تھی مشکل سے کھسکتا کھسکتا دروازے کے پاس آیا کنڈی کھولی؛ باہر نکلا اور تمام رات سڑک پر بیٹھ کر گذاری، صبح بی فہیمن سرخرو جونڈا آئیں، میں نے اُن کو بہت بُرا بھلا کہا اور حساب کر دیا۔ کیونکہ مثل مشہور ہے دشمن کا دوست اپنا دشمن، آج میرے ساتھ یہ سلوک کیا کل خدا جانے گلا گھٹوا دیں۔

نو بجے گھر میں آیا، کپڑے بدلے، بستہ بغل میں مارا ہوٹل گیا وہاں کھانا کھایا۔ پھر تعزیرات کی دفعات کو دیکھا۔ کوتوالی میں رپورٹ کی۔ لیکن انھوں نے مقدمہ کا چالان کرنے سے انکار کیا اس لیے خود استغاثہ لکھا اور دس بجے عدالت ضلع میں جاکر داخل کر دیا۔ تیس نفر کتوں اور مولوی قطمیر صاحب کو ملزمین بنایا۔ استغاثہ میں نقب زنی بوقت شب حسب دفعہ (۴۵۴) ڈاکہ زیر دفعہ (۳۹۵) اور سلاح مہلک کے ساتھ بلوہ زیر دفعہ (۱۴۸) تعزیرات ہند کے جرائم قائم کیے۔ کچھ دے دلا کر اُسی روز سمن جاری کرا دیے۔ سر رشتہ میں یہ اعتراض ہوا کہ کتوں پر سمن کی تعمیل کیونکر کی جائے۔ اُن کو فاترالعقل تو کہا نہیں جا سکتا کیونکہ میونسپل کمیٹی والے مقدمہ میں عدالت نے قرار دیا تھا کہ کتے فاترالعقل نہیں ہیں۔ اس لیے بالآخر بہت کچھ حجت کے بعد یہ طے پایا کہ کتوں کو نابالغ اور زیر پرورش مولوی قطمیر صاحب قرار دے کر مولوی صاحب پر جملہ سمنوں کی تعمیل کرا دی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ گو اس قانونی مسئلہ کے سُلجھانے میں میرے کئی روپیے صرف ہوئے، لیکن مجھے اس کی پروا نہ تھی کیونکہ مجھے یقین تھا کہ آخر میں مولوی صاحب کے جُرمانے میں

سے مجھے نو ہزار روپئے ضرور ملیں گے۔

مولوی صاحب کو یقین نہ تھا کہ معاملہ عدالت تک پہنچیگا اس لیے سمن پہنچنے کے بعد بہت گھبرائے اور مجھ سے آکر معذرت کرنے لگے کہ میرا اس معاملہ میں کوئی قصور نہیں ہے، ساری کارستانی میرے چھوکرے کی ہے۔ میں نے کہا کہ "مولوی صاحب میں شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ کی وجہ سے مجھے ایک اور ملزم کا نام معلوم ہوگیا۔ کل اس کو بھی زمرۂ ملزمین میں شریک کیے دیتا ہوں۔ اب رہا معاملہ کا تصفیہ تو وہ یوں ہوسکتا ہے کہ آپ محلہ کے تمام کتوں کو مار ڈالیں اور چونکہ عدالت سے آپ کے حق میں چھ سال کی قید اور دس ہزار روپئے جرمانہ کی سزا صادر ہونے والی ہے۔ اس لیے میں اتنا کرسکتا ہوں کہ اگر آپ نو ہزار روپئے بطور ہرجانہ ادا کریں تو میں مقدمہ سے دست برداری کرلوں گا۔ اگر آپ اس پر راضی نہیں ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ دنیا کی کوئی قوت آپ کو جیل خانہ جانے سے نہیں روک سکتی۔"

میری یہ قانونی بحث سُن کر مولوی صاحب حیران ہوگئے بہت جزبز ہوئے مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے اُٹھے۔ میں نے کہا "مولوی صاحب سنبھل کے بات کیجیے گا آپ کا یہ بڑبڑانا آپ کو ایک اور جرم کا مرتکب کیے دیتا ہے آئندہ آپ کے ہونٹ ہلے تو ابھی جاکر استغاثہ میں ازالہ حیثیت عرفی کی دفعہ (۵۰۰) تعزیرات اور بڑھا آتا ہوں۔" اس تقریر سے مولوی صاحب کے رہے سہے حواس گم ہوگئے اور وہ دروازے سے نکل کر دم

بھاگ گئے۔

مجھے توقع تھی کہ شاید مولوی صاحب پھر مصالحت کا دروازہ کھٹکھٹائیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی وکیل کے پھندے میں جا پھنسے اور آپ ان لوگوں سے اصول سے واقف ہیں کہ مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں ان کو اپنے جلوے مانڈے سے کام۔

بہرحال تاریخ پیشی آگئی اور میں کتابوں کا پشتارہ بغل میں مار ڈپٹی صاحب کے اجلاس پر پہنچ گیا۔ پہلی پیشی میرے ہی مقدمہ کی تھی۔ اندر جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ تیس چالیس کتے ایک رسی میں بندھے کھڑے ہیں۔ رسی کا سرا مولوی قطمیر صاحب کے ہاتھ میں ہے۔ اور مولوی صاحب مسٹر کولی بیرسٹرایٹ لا سے کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ ڈپٹی صاحب اس وقت تک اجلاس پر تشریف نہیں لائے تھے۔ میں نے کولی صاحب سے کہا:۔ "کیا آپ ان تمام ملزمین کے وکیل ہیں؟" انھوں نے کہا "ہاں"، میں نے کہا "کیا مناسب نہ ہوگا کہ ان ناپاک ہستیوں کو عدالت کے کمرے سے خارج کردیا جائے"۔ انھوں نے کہا "نہیں ملزمین کے مواجہ میں تحقیقات ہوگی" یہ بالکل قانون کے مطابق جواب تھا۔ لیکن چونکہ مجھے یقین تھا کہ ان ملزمین کو عنقریب حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہونے والی ہے۔ اس لیے دل پر جبر کر کے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دس بجتے ہی ڈپٹی صاحب اجلاس پر آئے، کتوں کا ہجوم دیکھ کر مسکرائے۔ اور فرمایا۔ "اچھا ہمارے نواب صاحب کا کوئی سنگین مقدمہ ہے" میں نے نہایت ادب سے سلام کر کے عرض کی "حضور والا خود

ملاحظہ فرمالیں گے کہ اس غریب پر کیا کیا ظلم توڑے گئے ہیں اس سے زیادہ میں کچھ عرض کر کے عدالت کی رائے پر اثر ڈالنا خلافِ قانون و انصاف سمجھتا ہوں۔"

مسٹر کولی نے کھڑے ہو کر کہا:۔ "مائی لارڈ اس مقدمہ کا دارو مدار محض قانونی مباحث پر ہے کیونکہ اس مقدمہ کے مستغیث اور ہمارے قدیم دوست مولوی اسد یار خاں صاحب نے نہ تو گواہوں کی کوئی فہرست استغاثہ کے ساتھ منسلک کی ہے اور نہ کوئی شہادت طلب کی گئی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی محض اپنے بیان اور قانونی مباحث پر اس مقدمہ کا تصفیہ کرانا چاہتے ہیں۔ اگر یہ صورت ہے اور مجھے یقین ہے کہ میرے فاضل دوست کو بھی اس سے انکار نہ ہوگا۔ تو میں نہایت ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ پہلے قانونی پہلو پر نظر ڈالی جائے، تاکہ اگر یہ ثابت ہو کہ ملزمین کے افعال سے کوئی جرم نہیں بنتا تو مقدمہ کو شہادت لسانی لیے بغیر ختم کر دیا جائے۔"

ڈپٹی صاحب نے میری طرف دیکھا میں نے عرض کیا "مجھے مسٹر کولی کی رائے سے پورا اتفاق ہے، اور میں عدالت کو باور کراتا ہوں کہ اگر اپنی تمام عمر میں میرے فاضل دوست نے کبھی کوئی سمجھ کی بات کہی ہے تو آج اور اس وقت کہی ہے۔"

مسٹر کولی۔ مائی لارڈ! میں اُمید کرتا ہوں کہ "میرے فاضل سینئر دوست کو میری قانونی واقفیت کی نکتہ چینی کرنے سے روک دیا جائے گا۔"

میں۔ میں دیکھتا ہوں کہ میرے فاضل دوست کا دماغ اپنی

کمزوری کی طرف رفتہ رفتہ پھر رجوع کر رہا ہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو میری تعریف کے لائق نہیں سمجھتے تو میں نہایت خوشی سے اپنے وہ الفاظ جو اُن کی تعریف میں میں نے استعمال کیے تھے۔ واپس لیتا ہوں، اور اگر وہ لفظ "فاضل دوست" میں لفظ "فاضل" کو اپنی توہین خیال فرماتے ہیں تو میں آئندہ سے بجائے "فاضل دوست" کے "بے وقوف دوست" استعمال کرنے کو تیار ہوں۔

ڈپٹی صاحب۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ نے عذر گناہ بدتر از گناہ کی صورت اختیار کی ہے۔ لیکن چونکہ مسٹر کولی اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ مستغیث نے جو کچھ کہا ہے وہ کسی بُری نیت سے نہیں کہا اس لیے وہ اس ریمارک سے در گذر کر کے اصل مقدمہ کی طرف رجوع کریں گے۔

مسٹر کولی۔ مائی لارڈ! میں حضور کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میرے موکلین میں سے اکثر کو نابالغ ظاہر کیا گیا ہے، اور میں یقین دلاتا ہوں کہ اُن میں سے اکثر جوان ہیں اور اکثر بال بچّے والے ہیں۔

میں۔ جناب والا یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ کتے کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہیں ہوتی اور اس کو میرے فاضل دوست بھی تسلیم کریں گے کہ بارہ سال والی ہر ہستی قانوناً نابالغ سمجھی گئی ہے۔ ایسی حالت میں میرا کتوں کو نابالغ قرار دینا کسی طرح غلط نہیں ہے۔ علاوہ ازیں مستغیث دوسرے کے بلوغ یا عدم بلوغ کا پتہ نہیں چلا سکتا، اگر مسٹر کولی اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر اپنے بعض موکلین کو نابالغ بیان کرتے ہیں، تو وہ ابھی ٹٹول ٹٹول کر بالغوں اور نابالغوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیں۔ میں استغاثہ میں صحت کر دوں گا۔ اِس سے استغاثہ پر

کوئی اثر نہیں پڑتا۔ البتہ وکیل صاحب کی عقل کا ضرور اندازہ ہوتا ہے۔

ڈپٹی صاحب۔ مسٹر کولی آپ اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔

مسٹر کولی۔ مناسب ہے کہ استغاثہ کو بحالت موجودہ چلنے دیا جائے۔

میں۔ یہ دوسری سمجھ کی بات ہے جو آج مسٹر کولی کے منہ سے نکلی ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ انھوں نے کہا اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دماغ اور ان کے اکثر موکلین کے دماغوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ جس کا وہ سابق میں اعتراف بھی کر چکے ہیں۔

مسٹر کولی۔ جناب والا میں اس قسم کے ریمارک کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ ممکن ہے کہ اشتعال طبع کی صورت پیدا ہو جائے، اور عدالت کوئی دوسری کارروائی کرنے پر مجبور ہو۔

ڈپٹی صاحب۔ میں مستغیث کو ہدایت کرتا ہوں کہ اگر آئندہ انھوں نے کوئی ایسی بات زبان سے نکالی جو تحقیر عدالت کی حد تک پہنچتی ہو تو میں حسب دفعہ (۴۸۰) ضابطہ فوجداری کارروائی شروع کروں گا۔

مسٹر کولی۔ میرے موکلین پر تعزیرات ہند کا جو پہلا جرم قائم کیا گیا ہے وہ نقب زنی ہے۔ میری ابتدائی حجت یہ ہے کہ کتے نقب زنی کا ارتکاب نہیں کر سکتے۔

میں۔ یہ حجت بلا دلیل ہے۔ میں یہ کہوں گا کتے نقب زنی انسان سے زیادہ سہولت سے کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے سخت پنجے اور ناخن ہیں اور انسان کے نہیں ہیں۔ ابھی ان کتوں اور مسٹر کولی کو سامنے کی

دیوار کھودنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ دیکھیں پہلے کتے سوراخ ڈالتے ہیں یا مسٹر کولی۔ دوسرے یہ بحث بھی الٹی کی گئی ہے اور کیوں نہ ہو۔ مسٹر کولی کے دماغ سے ایسی ہی بحث کی توقع کی جاسکتی ہے۔ استغاثہ میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ کتوں نے دیوار میں شوراخ کیا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ دیوار میں موہری پہلے سے موجود تھی اور آمد و رفت کے لیے نہیں بنائی گئی تھی بلکہ پخانہ کے پانی کے اخراج کے لیے تھی۔ دفعہ (۴۴۵) ضمن (۲) کے الفاظ یہ ہیں کہ "کسی ایسے راستہ سے داخل ہونا جو آمد و رفت کے لیے نہ بنایا گیا ہو" اس لیے کتوں کا موہری میں سے آنا حسب دفعہ محولہ یقیناً نقب زنی میں داخل ہے۔

مسٹر کولی۔ اس کا ثبوت؟

میں۔ جناب والا اب میں ثبوت میں کچھ عرض کروں گا تو پھر اعتراض کیا جائے گا۔ اگر اجازت ہو تو جواب دوں۔

ڈپٹی صاحب۔ اچھا اجازت ہے۔

میں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ موہری آمد و رفت کے لیے نہیں بنائی گئی تھی۔ مسٹر کولی اس کا ثبوت طلب کرتے ہیں۔ میں صرف یہ عرض کرتا ہوں کہ کیا کبھی اس موہری سے مولوی قطمیر صاحب میرے مکان میں تشریف لائے تھے۔ یا کبھی ان کے بال بچے اس راستہ سے آتے جاتے رہتے ہیں۔ اگر ان لوگوں میں سے کوئی نہیں آتا، تو ماننا پڑے گا، کہ یہ موہری انسان کی آمد و رفت کے لیے نہیں بنائی گئی اور اگر یہ لوگ اس موہری میں سے آمد و رفت رکھتے ہیں

تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ لوگ نہیں جانور ہیں۔
مسٹر کولی۔ مائی لارڈ، کیا ان الفاظ سے میرے موکل کی توہین نہیں ہوتی؟
میں۔ میں نے پہلے ہی حضور والا سے اجازت لے لی ہے، اب اگر مسٹر کولی ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ قائم کرنا چاہتے ہیں تو خود عدالت پر دائر کریں۔ میں ان کی طرف سے شہادت دینے کو تیار ہوں۔
ڈپٹی صاحب۔ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ موری کتنی بڑی ہے؟
مسٹر کولی۔ اس کے لیے مناسب ہے کہ موقعہ کا معائنہ کر لیا جائے۔
میں۔ میرے خیال میں بھی اس کی ضرورت ہے اور میں عدالت کو باور کراتا ہوں کہ یہ موری اتنی بڑی ہے کہ کتا تو کتا اگر جناب والا معائنہ موقعہ کے وقت مسٹر کولی کی گردن پکڑ کر موری میں ٹھونس دیں تو یہ بھی باوجود اس تن و توش کے بھیس پھنسا کر اس موری سے پار ہو جائیں گے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس فقرہ پر مسٹر کولی کو بہت تاؤ آگیا انھوں نے نہایت زور سے میز پر مکا مارا اور کچھ کہنا چاہتے تھے کہ اجلاس کا رنگ ہی بدل گیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ مسٹر کولی نے مکا مارتے وقت یہ خیال نہیں کیا کہ میرا ہاتھ میز پر رکھا ہوا ہے۔ بجائے میز پر پڑنے کے مکا میرے ہاتھ پر پڑا، بھلا میرے ہاتھ کی تحقیر عدالت ہوتی اور میں خاموش رہتا۔ چونکہ میں جانتا تھا کہ مجھے اشتعال طبع

ہو جانے کے وجوہ پیدا ہو گئے اور میں دفعہ (۳۰۰) کے مستثنیٰ اجہارم میں آگیا ہوں اس لیے میں نے میز پر کی دوات اُٹھائی (خدا جھوٹ نہ بلوائے کوئی تین پاؤ کی ہو گی) اور اُٹھاتے ہی مسٹر کولی کی طرف پوری طاقت سے پھینکی وہ اس وقت سر جھکائے ہوئے کچھ کہہ رہے تھے کہ دوات عین اُن کی چندیا پر پڑی، چندیا تھی صاف اور چکنی وہاں سے چھٹکی، پھسلنے کی وجہ سے اس کا رُخ اجلاس کی طرف ہو گیا، اور سیدھی ڈپٹی صاحب کنپٹی پر بیٹھی، اور چشم زدن میں مسٹر کولی کا سر اور ڈپٹی صاحب کا منہ ہم رنگ ہو گئے۔ اِدھر تو اجلاس کے چپراسی اپنی اپنی کمر سے پٹکے کھول کر ڈپٹی صاحب کا مُنہ پونچھنے کو دوڑے۔ اُدھر مسٹر کولی نے جست کی تو میز کے اُوپر۔ وہاں سے کود کر مجھ پر گرنا چاہتے تھے۔ مگر میں پہلے ہی سے اس حملہ کے لیے تیار تھا۔ پینترا کاٹ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بجائے مجھ پر گرنے کے کرسی پر گرے۔ اور کرسی سمیت اپنے بعض موکلین پر آپڑے۔ جو کتے دبے اُنھوں نے غل مچایا۔ ان کا ساتھ ان کے یاروں نے دیا۔ غرض ایک قیامت برپا ہو گئی۔ باہر کے لوگ دوڑے ہوئے آئے کہ دیکھیں اجلاس پر کیا مصیبت نازل ہوئی۔ ادھر سے یہ کتوں کا غول گھبرا کر نکلا، راستہ میں مڈ بھیڑ ہو گئی دو چار تماشائی تو جھپٹ میں آکر چیت ہو گئے۔ بعضوں کی ٹانگیں کتوں نے لیں۔ غرض ....

نوٹ:۔ یہاں سے پھر صفحات غائب ہیں۔
اس کے بعد جو صفحہ شروع ہوا ہے اس کے دیکھنے سے معلوم

ہوتا ہے کہ ہمارے نواب صاحب پر تحقیر عدالت کی کارروائی زیر دفعہ (۴۸۰) ضابطہ فوجداری شروع کرکے ان کا جواب لیا جا رہا ہے۔ سوال کا جوابتدائی حصّہ ہے وہ گم شدہ صفحہ میں ہوگا۔

لہٰذا

آپ وجہ ظاہر کیجیے کہ کیوں آپ کے خلاف حسبِ دفعہ (۴۸۰) ضابطہ فوجداری کارروائی کرکے تجویز مناسب نہ کی جائے۔ ۲۸ مئی

شرح دستخط کالب علی خاں۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ

یہ کاغذ مجھے دیا گیا۔ میں نے پڑھا، ذرا مسکرایا اور ڈپٹی صاحب سے عرض کی کہ کیا میں زبانی جواب دوں یا تحریری؟

ڈپٹی صاحب۔ تحریری۔

میں۔ کیا میں اپنے جواب میں صاف صاف ظاہر کردوں کہ جو لوگ قانون سے واقف نہیں اُن کا کرسی عدالت پر بیٹھنا خود تحقیر عدالت ہے، اور جن کا وجود خود تحقیر عدالت ہو وہ کسی دوسرے شخص پر تحقیر عدالت کا مقدمہ قائم کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔

ڈپٹی صاحب۔ آپ کو زبانی گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں ہے آپ کا جو جی چاہے وہ اپنے بیان تحریری میں لکھ دیجیے۔

میں نہایت اطمینان سے وہیں کرسی پر بیٹھ گیا، بستہ کھول کر قانونی کتابیں نکالیں، دفعات متعلقہ کو دیکھا اور حسبِ ذیل مسودہ تیار کیا۔

باجلاس عالیجناب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بہادر

مستغیث سرکار ذریعہ کپتان ڈپٹی کالب علی خاں صاحب بنام ... کارروائی زیر دفعہ ۴۸۰ ضابطہ فوجداری

نواب اسد یار خاں بہادر   مستغاث علیہ

بعرض ـــــــــ عالی ـــــــــ میر سانند

گذارش ہے کہ میرا اس کارروائی میں جواب طلب کیا جاتا ہے۔ لیکن جواب سے پہلے میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ جو طریقہ عدالت نے اختیار کیا ہے وہ سراسر خلاف قانون ہے۔ تحقیر عدالت ضروری ہوئی ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کس کی تحقیر عدالت ہوئی۔ مجھے اس بحث میں جانے کی ضرورت نہیں ہے، اور یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ عدالت کے کمرے میں جو داخل ہوتا ہے وہ خود عدالت کا جزو ہو جاتا ہے۔ اگر اس کی یا اُس کے کسی حصّہ کی تحقیر کی جائے تو وہ عدالت کی عین تحقیر ہے۔ اس لحاظ سے سب سے پہلے تحقیر عدالت میرے ہاتھ کی مسٹر کولی نے کی۔ اس کے بعد میں نے نہیں بلکہ دوات نے مسٹر کولی کے سر کی تحقیر عدالت کی، اور اس کے بعد مسٹر کولی کے سر نے (اس کو میں آخر میں ثابت کروں گا) ڈپٹی صاحب کی کنپٹی کی تحقیر عدالت کی اور مسٹر کولی نے کتوں کی تحقیر عدالت کی اور کتوں نے تماشائیوں کی تحقیر عدالت کی، ایسی صورت میں تمام اجزاء کو ترک کر کے صرف کنپٹی کی تحقیر عدالت کے متعلق کارروائی کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ مقدمہ میں تجزی قانوناً و اصولاً ناجائز ہے۔

۲۔ میں نے مسٹر کولی کے دوات ماری اور اس کا مجھے قانوناً حق تھا۔ ملاحظہ ہو دفعہ (۳۰۰) مستثنیٰ چہارم جس میں محکوم ہے کہ اشتعالِ طبع کی صورت میں قتل عمد بھی جرم نہیں ہوتا۔

مجھے حق حاصل تھا کہ اجلاس ہی پر مسٹر کولی کا گلا گھونٹ دیتا۔

لیکن میں نے صرف دوات کھینچ مارنے پر اکتفا کیا۔ یہ مسٹر کولی کا قصور تھا کہ وہ اُس وقت گردن جھکا کے کھڑے تھے اور دوات اُن کے سر پر لگی، اگر معمولی چندیا ہوتی تو اتنی بھاری دوات سے صرف اتنا ہوتا کہ کھوپڑی ٹوٹ جاتی اور کارروائی وہیں ختم ہو جاتی۔ یہ کبھی باور نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ خاص کرپ کے کارخانہ کی بنی ہوئی کھوپڑی ہے، یا گھر میں دباغت ہوتے ہوتے اتنی مضبوط ہوگئی ہے کہ اس پر سے ایسی بھاری دوات بھی رپٹ جائے گی۔ اگر دوات رپٹی تو وہ مسٹر کولی کی کھوپڑی کی مضبوطی کا قصور ہے نہ کہ میرا۔ کیونکہ یہ سوءِ اتفاقی صورت ہے۔ اور میں دفعہ (۸۰) تعزیرات کی رو سے بری الذمہ ہوں۔

۳۔ اب رہا یہ امر کہ دوات نے بجائے سیدھا جانے کے اجلاس کی طرف رُخ کیوں بدلا تو اس کا جواب بہت صاف ہے۔ مسٹر کولی کے سر کی چکنائی اس تبدیل رُخ کا باعث ہوئی اُن کی کھوپڑی نہ ایسی چکنی ہوتی اور نہ دوات اجلاس کی طرف جاتی، نہ ڈپٹی کلب علی خاں کی کنپٹی پر لگتی اور نہ کنپٹی کی تحقیر عدالت کا مقدمہ قائم ہوتا۔ ان حالات میں میں نہایت ادب سے عرض کروں گا کہ اگر جناب والا کو اپنی کنپٹی کے متعلق تحقیر عدالت کا مقدمہ قائم کرنا ہے تو مسٹر کولی کی کھوپڑی کی چکنائی پر قائم کیا جائے کیونکہ یہی چکنائی اس تحقیر کا باعث ہوئی، مجھ پر مقدمہ قائم کرنا اور صرف میرا جواب لینا قانوناً صحیح نہیں ہے۔

۴۔ یہاں میں ڈپٹی صاحب کو ایک قانونی صلاح دینا مناسب

سمجھتا ہوں گو میں جانتا ہوں کہ اُن کے دماغ میں ایسے نازک قانونی نکتہ کا اُترنا دشوار ہے مگر بقول سعدی رحمۃ اللہ علیہ ؎

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است	وگر خاموش بنشینم گناہ است

میں ڈپٹی صاحب کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ قانوناً مسٹر کولی کی کھوپری یا اس کی چکنائی پر بھی مقدمہ قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر افعال قدرت کی وجہ سے کسی کو کوئی نقصان پہنچ جائے تو وہ مجرم نہیں ہوتا۔ مثلاً ابھی اس مکان کی چھت بیٹھ جائے اور ڈپٹی صاحب دب کر مر جائیں تو نہ کوئی جرم ہوا اور نہ اس کے متعلق کوئی مقدمہ قائم ہو سکتا ہے کیونکہ یہ قدرت کا فعل ہے اور اس پر کسی کو اختیار حاصل نہیں ہے۔ بجنسہٖ یہی حالت مسٹر کولی کی ہے۔ ان کی چندیا قدرت نے صاف کر دی ہے (ممکن ہے کہ گھر والوں نے بھی اس صفائی میں کچھ حصہ لیا ہو) اس لیے اگر اس کی وجہ سے دوات کا رُخ بدلا تو یہ صورت افعال قدرت میں داخل ہے۔ اور مسٹر کولی جواب دہ قرار نہیں دیے جا سکتے۔ البتہ اگر یہ ثابت کیا جا سکے کہ آج خاص اسی غرض سے مسٹر کولی سر منڈوا کر اور تیل مل کر آئے تھے تو وہ یقیناً اپنی کھوپری کی چکنائی کے ذمہ دار ہوں گے۔

لہٰذا استدعا ہے کہ

کارروائی ختم اور مثل داخل دفتر کی جائے۔ اور چونکہ اپنی درخواست کے فقرہ (۴) میں میں نے مسٹر کولی کی جانب سے وکالت کی ہے اور ان کو ایک سنگین مقدمہ سے بچا لیا ہے اس لیے مجھے اُن سے معقول محنتانہ دلایا جائے۔

نوٹ:۔ مناسب ہوگا کہ عدالت مسٹر کولی کو ہدایت کردے کہ وہ آئندہ جب اجلاس پر آئیں تو اپنے سر پر اچھی طرح سیندھ ہیر (رینگمال) مل کر آیا کریں تاکہ اس قسم کے واقعات کا ہمیشہ کے لیے سدِّ باب ہو جائے۔ واجب تھا عرض کیا گیا۔

دستخط۔ نواب اسد یار خاں

ڈپٹی صاحب جواب پڑھ کر بہت گھبرائے لیکن بے حیائی تیرا ہی آسرا ہے کچھ سمجھے سمجھائے تو نہیں چار سطر کی ایک تجویز ٹھونک ماری کہ "ملزم کا بیان دیکھا گیا۔ ہماری رائے میں جو جواب ملزم نے دیا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ

نوٹ:۔ اس کے آگے کے صفحات غائب ہیں۔

....

غالب بیسنی روٹی کی تعریف کریں تو کریں، میں تو یہی کہوں گا کہ لعنت ہے بیسن اور بیسنی روٹی پر، میرا ہی دل خوب جانتا ہے کہ اس بیسنی روٹی نے مجھے کیا کیا ناک چنے چبوائے ہیں۔ میں نے تو عہد کر لیا ہے کہ زہر کھاؤں گا، مگر بیسنی روٹی کے پاس نہ جاؤں گا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ ابر آیا ہوا تھا کچھ پھوار بھی پڑ رہی تھی ہماری ماماجی باورچی خانہ سے مسکراتی ہوئی آئیں اور کہا "میاں کہو تو آج بیسنی روٹی پکا لوں"۔ میں نے کہا "اچھا پکالو، موسمی چیز ہے۔ مگر خدا کے لیے کچی نہ رکھنا ایسا نہ ہو کہ بدہضمی ہو جائے"، بڑی بی بولیں "نوج میاں ایسی فال زبان منہ سے نہ نکالیے، دُور پار، میں کوئی آپ کی دشمن ہوں کہ کچی روٹیاں کھلا کر دشمنوں کے

بیمار ڈالوں گی" یہ کہہ کر جو وہ باورچی میں گھسیں تو اللہ کی بندی نے ایک بجا دیا۔ میں کھانے والا نو بجے کا، انتظار کرتے کرتے بیزار ہوگیا۔ لیکن روٹیاں نہ آنی تھیں نہ آئیں، انہوں نے ڈیڑھ لاکھ قل ہو اللہ کا ختم پورا کیا۔ جب کہیں خدا خدا کر کے بڑی بی کی شکل نظر آئی۔ مجھے تاؤ تو بہت تھا مگر بیسنی روٹیوں کو دیکھ کر ٹھنڈا پڑ گیا۔ ایسی پتلی پتلی اور سرخ سرخ تھیں کہ دل لوٹ گیا۔ کھانے پر جو ڈٹا تو بندوق بھر لی، سچ ہے چنا اور غلام منہ لگ کر نہیں چھوٹتا۔ اتنا کھایا اتنا کھایا کہ حلق تک آگیا۔ جب دسترخوان صاف ہوگیا تو خدا خدا کر کے اٹھا، پانی پیا اور ذرا لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں لگی پیاس۔ اٹھ کر پانی پیا، پھر پیا، لیکن پیاس تھی کہ کس طرح نہ بجھتی تھی، پیٹ پھول کر نقارہ ہوگیا۔ اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ باہر نکل کر کیا دیکھتا ہوں کہ ڈپٹی کلب علی صاحب کھڑے ہیں۔ یہ اکثر میرے غریب خانہ پر تشریف لانے لگے تھے۔ جب کوئی پیچیدہ قانونی مسئلہ پیش آجاتا تو حل کرنے اکثر میرے پاس آجاتے تھے۔ خیر اُن کو ساتھ لے، دیوانخانے میں جا بیٹھا۔ سامنے میز پر "رسالہ نمائش" رکھا تھا وہ انھوں نے اٹھا لیا اور اُس کے دیکھنے میں محو ہوگئے، میرے پیٹ کی بڑی حالت تھی، بس پھٹنے کے قریب تھا۔ کسی طرح چین نہ آتا تھا۔ آرام کرسی پر میں نے بہت بہت پہلو بدلے، ٹانگیں کرسی کی دستیوں پر پھیلا کر سہولت راہ پیدا کی، توند کو کچھ سہلایا، کچھ دبایا، مگر باوجود اس قدر کوششوں کے ایک بھی امر باعث ندامت صادر

نہ ہوا۔ اسی جد وجہد میں آنکھ لگ گئی، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے غدار شہر میں جا رہا ہوں، سڑکیں صاف اور ستھری ہیں مگر تیلی تیلی۔ مکان خوشنما اور خوبصورت ہیں، مگر نیچے نیچے۔ بازاروں میں خوب چہل پہل ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے میں مصروف ہے۔ بعض بفکرے کوٹ پتلون پہنے، سگرٹ منہ میں دبائے، لکڑی ہلاتے سیر گشت کر رہے ہیں۔ بیچوں بیچ شہر میں ایک عالی شان عمارت ہے طالبعلم بستے بغل میں دبائے اُس میں چلے جا رہے ہیں مجھے بھی شوق ہوا، دل میں کہا چلو، چلتے چلتے یہاں کا طریقۂ تعلیم بھی دیکھ لیں، اندر گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ سیکڑوں طالب علم اکڑوں بیٹھے، کتابیں اگلے بنچوں پر رکھے پروفیسر صاحب کا لکچر سُن رہے ہیں۔ اب جو میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان سب کی شکلیں انسانوں کی بہ نسبت کتوں سے زیادہ ملتی جلتی ہیں۔

پروفیسر صاحب کی ہئیت کذائی دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی، اگر کوئی جاندار ان کے ہم شباہت ہونے کا دعوی کر سکتا ہے تو وہ صرف خارشتی لینڈی کتا ہے۔ اُن کی مختصر ناک پر بڑے تالوں اور سیاہ کمانیوں کی فیشن ایبل عینک عجب بہار دے رہی تھی۔

سیاہ کوٹ پتلون زیب تن تھا، پشت کی طرف پتلون کا اُبھار ظاہر کر رہا تھا کہ زبردستی کسی چیز کو موڑ کر اندر دیا گیا ہے، کوٹ کے اوپر سیاہ گون اور سر پر پھندے دار چوکونی ٹوپی تھی، وہ اس وقت علم ارتقا پر لکچر دے رہے تھے۔ جس وقت میں داخل ہوا تو وہ فرما رہے تھے "جو ہستی فطرت کے اصول کو تبدیل

کر سکے اُسی کو حق حاصل ہے کہ اشرف المخلوقات کا لقب اختیار کرے،
فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر جاندار مار پڑنے پر چیخے چلائے اور آنسو
بہائے، سوائے کتوں کے آپ ایک جاندار بھی ایسا نہیں بتا سکتے جو
اس اصول مقررہ پر کاربند نہ ہوتا ہو۔ کتے ہی وہ قابلِ قدر ہستی ہیں
جو اس اصولِ فطرت کے تابع نہیں ہیں۔ وہ مار کھانے پر چیخنے اور
رونے کے بجائے واہ واہ، واہ واہ کے نعرے لگاتے ہیں، اور اس طرح
تعریفوں سے مارنے والے کا دل بڑھاتے ہیں، فطرت کا دوسرا
مسلّمہ اصول یہ ہے کہ زمانہ کی ٹھوکریں بڑے بڑے ٹیڑھوں کو سیدھا
کر دیتی ہیں۔ لیکن تجربہ بتا رہا ہے کہ بارہ برس تک کتے کی دُم زمین
میں دبائی گئی پھر بھی وہ ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہی۔

اس سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ کتے ہی اشرف المخلوقات کا
لقبِ اختیار کرنے کے مستحق ہیں۔ چنانچہ بعض عاقل اور سمجھ دار
انسانوں نے اپنے سے کتوں کو افضل مانا اور تسلیم کیا ہے۔

(یہاں سے کچھ حصّہ غائب ہے)

....

حلم کتوں کا شیوہ ہے اور متانت ان کا شعار، کتوں کی اتنی
تعریفیں سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ مجھ سے نہ رہا گیا،
اور میں نے چیخ کر کہا "ابے کتے کے بچّے! اپنے مُنہ میاں مٹھو! تم
کتے تھے، کتے ہو اور ہمیشہ کتے ہی رہو گے" پروفیسر صاحب نے
نظر اُٹھا کر میری طرف دیکھا، اُن کو ایک غیر جنس نظر آیا۔ اپنی
ساری متانت بھول گئے کرسی پر سے قلابازیں مارتے، میری طرف

سپلکے۔ اُن کے ارادہ کا اندازہ کر کے میں دروازہ کی طرف بھاگا، میں آگے اور وہ پیچھے، دروازہ قریب تھا۔ میں نکل یہ جا وہ جا ہوگیا۔ مگر وہ بھی خالی ہاتھ نہ گئے۔ میرے پائچوں کے حد اتصال کا کچھ حصّہ اپنے منہ میں لے گئے، وہ سمجھے کہ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی، میں سمجھا چلو جان بچی لاکھوں پائے۔ فی الحال میانی بہ شد نہ شد، گھر جاکر دوسری ڈلوالیں گے۔

(اس کے بعد کا کچھ حصّہ غائب ہے)

بازار میں ٹہل رہا تھا کہ چند کتے پولیس والوں کا لباس پہنے گلے میں پٹے اور زنجیریں ڈالے میری طرف آئے، ایک نے جو اُن کا افسر معلوم ہوتا تھا اپنا پنجہ میری پیٹھ پر رکھا اور کہا کہ "آپ کو قتل عمد کے الزام گرفتار کیا جاتا ہے" میں نے کہا کہ "میں نے کسی کو قتل نہیں کیا" اُس نے جواب دیا کہ "اس وقت آپ جو کچھ بیان کریں گے وہ آپ کے خلاف شہادت میں استعمال کیا جا سکے گا" چونکہ یہ قانونی جملہ تھا اس لیے میں خاموش ہوگیا۔ ایک نے اپنی گردن میں سے پٹہ اور زنجیر کھولی۔ پٹہ میری گردن میں ڈال دیا اور زنجیر افسر کے ہاتھ میں دے دی، میں نے چلنے میں ذرا چپڑ چپڑ کی تو اُس کے ساتھ والوں نے بھونکنا اور مُنہ مارنا شروع کیا۔ خلقت کا اژدہام ہوگیا، کتوں کا یہ مجمع خلاف قانون دیکھ کر میرے اوسان باختہ ہوگئے۔ ہمت نے جواب دے دیا، اور میں کان دبائے ان کتوں کی پولیس کے ساتھ ہوگیا۔ پہلے یہ مجھ کو اسٹیشن ہاؤس پر لے گئے وہاں سے ایک دفتر مثلوں کا نکالا

اور دو چار کانسٹبلوں کو مدعیوں اور گواہوں کو بلانے کے لئے بھیجا، دس بجتے ہی مجھ کو عدالت میں لے گئے، اور ملزمین کے کٹھرے میں کھڑا کردیا۔ اندر جاکر کیا دیکھتا ہوں کہ تمام کمرہ کنوؤں سے بھرا ہوا ہے، تل رکھنے کو جگہ نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میری گرفتاری کی خبر نے یہ مجمع کثیر جمع کردیا تھا، اجلاس پر ایک بڑا زبردست بلڈاگ بالوں دار ٹوپی (وِگ) پہنے ناک کی پھننگ پر عینک رکھے، سُرخ گون زیب تن کیے بیٹھا ہے، سامنے ایک لمبی میز پر دونوں جانب وکلا کی قطار ہے، یہ رنگ دیکھ کر میری آنکھوں میں ڈپٹی کلب علی خاں کے اجلاس کا نقشہ پھر گیا۔ گو اس مجسٹریٹ کی شکل بالکل تو اُن سے ملتی نہ تھی۔ لیکن دونوں میں شباہت ضرور تھی، مجسٹریٹ صاحب نے بہت غرّا کر کہا .... "کیا ملزم حاضر ہے؟"

پیروکار سرکار اٹھے، کیا کہوں عین مین مسٹر کولی معلوم ہوتے تھے، اگر فرق ہوگا تو بس انیس بیس کا ہوگا۔ انھوں نے پہلے اپنی طرف دیکھا، عینک ٹھیک کی۔ گون کی ایک پٹی کو انگلی پر لپیٹا۔ گردن جھکائی، پھر اُٹھائی، پھر جھکائی اور کہا کہ :-

پیروکار سرکار۔ جناب والا ملزم حاضر ہے، اُس پر وارنٹ کی تعمیل باقاعدہ طور پر ہوئی ہے، اور اس کے خلاف جس قدر چالان ہیں وہ بالکل تیار ہیں، مدعی بھی حاضر ہیں اور گواہ بھی موجود ہیں۔

مجسٹریٹ :- مسٹر ٹوبی اس وقت کتنے مقدمات ایسے ہیں جن کی

تکمیل آج کی جا سکتی ہے؟

مسٹر لوٹبی۔ مائی لارڈ! یوں تو ملزم کے خلاف ہزارہا مقدمات ہیں۔ لیکن اُس نے اکثر ایسے موقعوں پر اور اس طرح ہمارے عزیز بھائیوں کو ہلاک کیا ہے کہ اُن کے متعلق کوئی گواہ ہم کو ہمدست نہ ہو سکا۔ لیکن پھر بھی اس وقت ڈیڑھ سو مقدمات ایسے تیار ہیں جن میں مکمل شہادت پولیس کو فراہم ہو چکی ہے، اور انھیں کی تحقیقات میں جناب والا کے اجلاس پر کرانا چاہتا ہوں۔

مجسٹریٹ نے میری طرف دیکھا اور کہا کہ "تم ان مقدمات میں خود پیروی کرو گے یا کوئی وکیل مقرر کرنا چاہتے ہو؟"

میں۔ جناب والا میں اپنے مقدمات میں خود پیروی کرتا ہوں، لیکن میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ میں کس کے قتل کے الزام میں ماخوذ کیا گیا ہوں، اور آپ کو ان مقدمات کی سماعت کا اختیار کیسے حاصل ہوا ہے۔ اگر کسی کتے کو کتے نے مارا ہوتا تو البتہ اس مقدمہ کی سماعت اس اجلاس پر ہو سکتی تھی۔ مگر جب کسی مقدمہ میں کوئی انسان ملزم قرار دیا گیا ہو تو اس کی سماعت انسانوں ہی کی عدالت میں ہو سکتی ہے۔

مسٹر لوٹبی۔ مائی لارڈ، ملزم کا استدلال صحیح نہیں ہے۔ میں ملزم کی اُس بحث کے باضابطہ نقول داخل عدالت کرتا ہوں، جو اُس نے ڈپٹی کلب علی خاں صاحب کے اجلاس پر کی تھی، جب اُنھوں نے خود مستغیث بن کر اور کتوں کو ملزمین قرار دے کر انسان کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا تھا، تو کوئی وجہ نہیں معلوم

ہوتی کہ وہ مقدمات جن میں کتے مستغیث اور یہ ملزم ہیں کتوں کی عدالت میں کیوں سماعت نہ کیے جائیں۔

میں۔ اگر اس بحث کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو مجھ کو یہ عذر ہے کہ ہلاکت انسانوں کی عدالت کے حدود اختیاری میں واقع ہوئی ہے اس لیے ان مقدمات کی سماعت حسب دفعہ (۱۸۰) ضابطہ فوجداری ہند موجودہ اجلاس پر نہیں ہوسکتی۔

مسٹر ٹوبی۔ شاید ملزم کو دفعہ (۱۸۰) ضابطہ فوجداری ہند کے اس جزو کا خیال ہے جس کی رو سے مقدمات قتل کی تحقیقات صرف اُسی عدالت میں ہوسکتی ہے، جس کی حدود میں ہلاکت واقع ہوئی ہو، لیکن ملزم پر یہاں یہ ظاہر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں ضابطہ فوجداری ہند نہیں، بلکہ ضابطہ فوجداری کلاب نافذ ہے، اور اس کی جو دفعہ اس کارروائی سے متعلق ہے وہ دفعہ (۱۸۱) ضمن (۱) ضابطہ فوجداری ہند کے مماثل ہے۔ اس میں مرقوم ہے کہ مقدمات قتل کی تحقیقات نہ صرف اُسی عدالت میں ہوسکتی ہے جہاں ہلاکت واقع ہوئی ہو بلکہ اُس عدالت میں بھی ہوسکتی ہے جہاں ملزم پایا جائے۔

میں۔ مگر ضابطہ فوجداری کلاب انسانوں سے متعلق نہیں ہوسکتا۔

مسٹر ٹوبی۔ اس کے دو جواب ہیں، ایک عقلی دوسرا نقلی، جس عدالت میں مقدمہ کی تحقیقات کی جائے اُس میں وہی قانون استعمال کیے جائیں گے جو وہاں کی مجلس وضع قوانین نے

نافذ کیے ہوں، میں اوپر ثابت کر آیا ہوں کہ ملزم کے خلاف جو مقدمات ہیں اُن کی تحقیقات اِسی عدالت میں ہو سکتی ہے، اس لیے اسی ملک کے نافذہ قانون اُن مقدمات کے انفصال میں استعمال ہوں گے۔ دوسری بحث کے متعلق میں ملزم کے اُن استغاثوں کی باضابطہ نقول داخل کرتا ہوں جو اُس نے اپنے ملک کی عدالت میں پیش کیے تھے۔ وہاں اس نے کتوں پر تعزیرات ہند کے الزامات لگائے ہیں۔ جب انسان کی عدالت میں کتوں کی تحقیقات تعزیرات ہند کی رو سے ہو سکتی ہے تو میں کوئی وجہ نہیں پاتا کہ کتوں کی عدالتوں میں انسانوں کی تحقیقات خود کتوں کے قوانین نافذہ کے تحت کیوں نہ کی جائے۔

مجسٹریٹ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ملزم اپنے دشمنوں کے ملک میں اپنی خوشی سے کس طرح آ گیا۔

مسٹر لوٹی۔ مائی لارڈ، یہ ہمارے ملک کی پولیس کا ایک روشن کارنامہ ہے، ان مقدمات کے مفتش کے لیے سب سے اہم اور مشکل کام ملزم کی گرفتاری تھا، لیکن ملزم کی ماما کی اعانت اور ہمارے وارنٹ نے جو بیسنی روٹی کی شکل میں نافذ ہوا تھا اُس کو بآسانی ہمارے قبضہ میں پہنچا دیا۔

یہ سُن کر مجھے بہت تاؤ آیا اور میں نے عہد کر لیا کہ اگر بخیر و خوبی اس مخمصہ سے نجات پائی تو گھر جا کر بڑھیا کا گلا ہی گھونٹ دوں گا۔ رہی بیسنی روٹی تو وہ آئندہ نہ میں کھاؤں گا نہ حتی المقدور دوسروں کو کھانے دوں گا۔ بس سمجھ لو کہ اس وقت تک تو صرف

گیہوں سے دشمنی تھی آج سے چنے سے بھی بیر ہے۔

مجسٹریٹ۔ مسٹر ٹوڈی آپ اپنا سب سے مضبوط مقدمہ پیش کیجیے تاکہ ملزم پر اگر جرم ثابت قرار پائے تو اس کی تجویز موت کے ساتھ بقیہ کل مقدمات کا خود بخود خاتمہ ہوجائے۔

مسٹر ٹوڈی۔ مائی لارڈ! میں اس قیمتی مشورے کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور سب سے پہلے مولوی قطمیر صاحب کے کتے کے قتل عمد کا مقدمہ شروع کرتا ہوں۔

مسٹر ٹوڈی نے مقدمہ کے واقعات تفصیل سے بیان کیے اور جس طرح پتھر کے گرنے سے اس کتے کی موت واقع ہوئی تھی۔ اس کی صراحت کرنے کے بعد کہا کہ........ "مائی لارڈ میں اپنی بحث کے آخر میں ثابت کروں گا کہ قتل عمد کے لیے یہ لازم نہیں کہ ملزم خود اپنے ہاتھ سے کسی کی ہلاکت کا باعث ہو، بلکہ بعض صورتوں میں ملزم کے ایسے افعال بھی جو بظاہر جرم نہ معلوم ہوتے ہوں اس کو جرم قتل عمد کے تحت میں لے آتے ہیں۔ اس قدر بحث کے بعد اب میں مقدمہ میں شہادت پیش کرتا ہوں، اس مقدمہ کا پہلا گواہ وہی مفتش ہے جس کی کارگزاری بالآخر اس ملزم کی گرفتاری کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔" گواہ کو آواز دی گئی، اس نے گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے ہوکر حلف لیا۔ جس کو میں سمجھ نہ سکا۔ اس لیے میں نے اعتراض کیا کہ "حلف اس طرح اور اس طریقہ سے ہونا چاہیے کہ جس سے ملزم کو اطمینان ہوجائے کہ گواہ سچ بول رہا ہے۔"

مجسٹریٹ "حلف کا یہ اصول صحیح نہیں ہے، چونکہ عدالت گواہ کے سچے یا جھوٹے ہونے کی تنقید کرتی ہے، اس لیے حلف اس طرح اور اس طریقے سے لیا جاتا ہے جس سے عدالت مطمئن ہو جائے کہ جو کچھ اس کے سامنے بیان کیا جا رہا ہے وہ قابلِ اعتبار ہے" مفتش نے واقعات مقدمہ بیان کیے، اور آخر میں میرے طریقہ گرفتاری پر روشنی ڈالی، اس سے معلوم ہوا کہ :۔

میری ماما کتوں کی بڑی شوقین تھی، اور ایک کتے سے جو دراصل مفتش مقدمہ تھا اس کو بڑی محبت ہو گئی تھی۔ اس کتے نے رفتہ رفتہ اپنے طرزِ عمل سے اس بڑھیا پر ثابت کیا کہ اس کو بسینی روٹی کا بہت شوق ہے چنانچہ چند روز تک وہ بڑھیا چرا چھپا کر اس کتے کو بسینی روٹی کھلاتی رہی۔ ایک دن اُس نے مجھے بھی بسینی روٹی کھانے پر آمادہ کیا، تاکہ بچے ہوئے ٹکڑوں سے اس کتے کا بھی کھانا نکل آئے۔ یہ وہ جال تھا جس میں مجھے پھنسایا گیا، اور میں عدم واقفیت کی وجہ سے اس مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔

مفتش کے ابتدائی بیان کے بعد میں نے اُس پر جرح کرنی چاہی تو اُس پر مسٹر لوبی نے کہا کہ اس عدالت میں کسی گواہ پر جرح کی اجازت نہیں دی جاتی اور نہ ہمارے قانون شہادت میں جرح کی کوئی دفعہ قایم کی گئی ہے۔

میں۔ لیکن قانون شہادت ہند کی رو سے کوئی بیان قابل ادخال شہادت نہیں ہو سکتا جب تک فریق ثانی کو اُس پر جرح کا موقع نہ دیا گیا ہو۔

مجسٹریٹ - جرح اس لیے کی جاتی ہے کہ گواہ کی سچائی کا امتحان ہو سکے جب ایک گواہ حلف لے کر کچھ ظاہر کرے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بیان کو سچ کیوں نہ سمجھا جائے۔

مسٹر لوٹبی - مائی لارڈ، ملزم اُن لوگوں کے قانون کا حوالہ دے رہا ہے جو حلف لے کر بھی جھوٹ بولنے میں تأمل نہیں کرتے، اور جو حلف کی وقعت کو نہیں سمجھتے - جناب والا کا ارشاد بالکل صحیح ہے، یا تو گواہ کو حلف نہ دیا جائے، اور اُس کی صداقت کا امتحان بذریعہ جرح کیا جائے - یا اس کو حلف دیا جائے تو اس کے بیان پر بلا جرح اعتبار کرنا چاہیے -

مجسٹریٹ - دوسرے گواہ کو بُلایا جائے -

آواز دی گئی اور ایک سفید چادر میں لپٹی ہوئی عورت کٹہرے میں داخل ہوئی میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا، کہ یہ میری چاہتی بلّی ہے - غضب ہے جس کو میں جان کے برابر رکھتا تھا، وہی آج میرے خلاف شہادت دینے آ کھڑی ہوئی، سچ ہے بلّی کی ذات بڑی بے وفا ہوتی ہے -

گواہ نے مسٹر لوٹبی کے سوالات کے جواب میں بہ حلف بیان کیا کہ میں ملزم کے پاس ایک عرصہ سے رہتی ہوں، اُن کے مکان سے ملا ہوا مولوی قطمیر کا مکان ہے، ملزم کے مکان کے پیچلانے کی مُہری، مولوی صاحب کے مکان میں نکلتی ہے، تقریباً چھ ماہ کا عرصہ ہوا ہوگا کہ ....

(آگے کے صفحات غائب ہیں، جس میں گواہوں کے بیانات،

بحث اور فیصلہ کا بڑا حصہ ہو گا جو صفحہ اس کے بعد کا ہے وہ فیصلہ کے جزو آخر سے شروع ہوتا ہے)

بہرحال شہادت پیش شدہ سے مُہری کے عین اُوپر کی منڈیر پر پتھر کا رکھنا۔ پتھر سے رسی باندھ کر اس کا دوسرا سرا مُہری کے سامنے کیل سے لپیٹ دینا۔ مولوی قطمیر صاحب کے کتے کا مُہری میں سے نکلنے کی کوشش کرنا، اس کوشش کرنے میں رسی کا اُس کے سر سے ٹکرانا اور پتھر کا اوپر سے گر کر اُس کو ہلاک کرنا پوری طرح ثابت ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ملزم کے ایسے افعال کا مجموعہ جو فرداً فرداً جرم نہ ہوں اس کو قتل عمد کا مجرم قرار دے سکتا ہے یا نہیں۔ اس بارے میں مسٹر ٹوبی نے نہایت لیاقت سے بحث کی ہے اور عدالت کو اُن کی حجت سے پورا اتفاق ہے۔ اگر ملزم جانے یا باور کرنے کی وجہ رکھتا ہو کہ اس کے افعال سے ہلاکت واقع ہونے کا احتمال ہے یا غالباً اس کا نتیجہ ہلاکت ہے یا وہ افعال حسب طبیعت معہودۂ جانداران ہلاکت کے لیے کافی ہیں تو ملزم کے ایسے افعال اُس کو جرم قتل عمد کے تحت میں لے آئیں گے، اور جیسا کہ ہم شہادت سے بحث کرتے ہوئے ثابت قرار دے چکے ہیں کہ ملزم کو یہ معلوم تھا کہ مولوی قطمیر صاحب کا کتا اس مُہری سے آمد و رفت رکھتا ہے تو اس کا ایسا بڑا پتھر اس طرح منڈیر پر رکھنا اور اس کا سلسلہ رسی سے اس طرح قائم کرنا مُہری سے آنے جانے والے کی ذرا سی ٹھیس سے وہ گر سکے

اور بلحاظ اپنی جسامت کے ایک بڑے سے بڑے کتے کے ہلاک کرنے کو کافی ہو تو اس کے افعال بدنیتی پر دلالت کریں گے اور اس کا قانونی نتیجہ یہی نکلے گا کہ ملزم نے وہ افعال اس نیت سے کیے تھے کہ مولوی تطمیر صاحب کے کتے کی ہلاکت واقع ہو۔

ان تمام حالات پر غور کرنے کے بعد میں ملزم پر جرم ثابت قرار دیتا ہوں اور چونکہ ورثائے مقتول خواہان قصاص ہیں لہٰذا

حکم ہوا کہ

ملزم کتے مار خاں کو بپاداش جرم قتل عمد ہلاک کیا جائے۔ اور ایک درجن کتے اس کے پیچھے اس غرض سے چھوڑے جائیں کہ وہ ملزم کو اُس وقت تک کاٹیں اور بھنبوڑیں کہ اس کی جان جسم سے نکل جائے، ملزم کی تمام جائداد ضبط کی جائے اور حسب دفعہ (۵۴۵) ضابطہ فوجداری ورثائے مقتول میں تقسیم کردی جائے۔

دستخط مسٹر بل ڈاگ سشن جج کتانگر

نوٹ۔ فیصلہ کی فوراً تعمیل کی جائے۔

میں۔ مگر جناب والا مجھے مرافعہ کا حق حاصل ہے اور ابھی اس فیصلہ کا نفاذ لوکل گورنمنٹ کی منظوری کا محتاج ہے۔

مجسٹریٹ۔ یہاں مرافعہ کا نہ کوئی قاعدہ ہے اور نہ لوکل گورنمنٹ کی منظوری کی ضرورت۔ یہ اُن ممالک کا دستور ہے جہاں گواہوں کے بیانات پر اعتبار نہ کرنے کی وجہ ہوتی ہے چونکہ ہماری عدالتوں میں کوئی گواہ حلف لے کر جھوٹ نہیں بولتا اس لیے شہادت سے صرف ایک ہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے، اور اسی لیے یہاں نہ کوئی

عدالت مرافعہ قائم کی گئی ہے اور نہ لوکل گورنمنٹ کو عدالتی کارروائیوں میں کوئی دخل ہے۔

(پولیس والوں کی طرف دیکھ کر)

مجرم کو مقتل میں لے جاؤ۔

مجسٹریٹ کا حکم سنتے ہی پولیس والے کشاں کشاں مجھے ایک بڑے میدان میں لے گئے۔ اس میدان کے چاروں طرف اونچے اونچے کٹہرے تھے۔ تمام شہر اس قتل کا تماشا دیکھنے امنڈ پڑا تھا۔ کٹہرے کے گرد کتوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ تھے۔ جہاں تک نظر جاتی تھی کتے ہی کتے نظر آتے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ میرے جلادوں میں خود مجسٹریٹ صاحب بھی شریک ہیں۔ میری غیرت کو حرکت ہوئی اور میں نے ٹھان لی کہ مرنا برحق ہے، مگر مرتے مرتے دو چار کتوں کو موت کے گھاٹ ضرور اتاروں گا۔ مجھے میدان میں ان جلادوں سے کوئی دس قدم آگے کھڑا کیا گیا۔ ایک کتا میدان میں جھنڈی لے کر آیا۔ جب اس نے دیکھا کہ سب مستعد ہو گئے تو ایک دفعہ ہی اس نے جھنڈی گرائی اور میری موت اور زیست کی دوڑ شروع ہوئی، میں نے بھی وہ وہ چکر دئیے اور وہ وہ پلٹیاں لیں کہ بہت سے کتوں کی کمریں توڑ دیں۔ جو کوئی قریب آیا اس کو دو چار لاتیں رسید کیں۔ کسی کو اٹھا کر پٹکا، کسی کو گردن دبا کر چھوڑ دیا۔ غرض یہ کہ جتنے کتے تھے وہ تھک کر بیٹھ رہے، اور میدان میں صرف مجسٹریٹ صاحب

اور بس رہ گئے۔ اب میری بھی ہمت بڑھی، اور میں نے للکار کر کہا کہ:۔

"حرامزادہ مجسٹریٹ اب دیکھ تجھے مجسٹریٹی کا مزہ چکھاتا ہوں۔ بڑا کلب علی خاں کا باوا بن کر اجلاس پر بیٹھا تھا۔ آج چھٹی کا دودھ یاد نہ دلایا ہو تو میرا نام کتے مار خاں نہیں"!

یہ کہتے ہوئے میں مجسٹریٹ کی طرف جھپٹا۔ اُدھر سے وہ بڑھا، اِدھر سے میں بڑھا۔ دونوں دست و گریبان ہو گئے۔ میں نے اس کی تھوتنی پکڑی، اُس نے میرے منہ پر پنجہ مارا۔ میں نے اس کو نوچا اُس نے مجھ کو کاٹا۔ میں نے اُس کو گرایا۔ اس نے مجھے دے مارا۔ میرے کپڑوں اور اس کی کھال کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، دونوں لہو میں تر بتر تھے۔ لیکن نہ میں اُس کی گرفت چھوڑتا تھا اور نہ وہ پیچھے ہٹتا تھا، میں نے دیکھا کہ جتنا وقت گزرتا جاتا ہے میرے قویٰ مضمحل اور میرے ہاتھ پاؤں جواب دیتے جاتے ہیں۔ اُس خونخوار کتے نے بھی میری کمزوری کو محسوس کر لیا، اور آخری حملہ کے لیے اپنی تمام قوت صرف کر کے اپنے پنجے میری گرفت سے چھڑا لیے۔ چھڑانے کے ساتھ ہی اُس نے میری گردن دبائی۔ میرا سانس رُکنے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے ایک چیخ ماری اور چیخ کے ساتھ ہی میری

آنکھ کھل گئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میں نیچے پڑا ہوں۔ اور ڈپٹی کلب علی خاں صاحب میرے سینہ پر سوار میرا ٹینٹوا دبا رہے ہیں۔ اُن کی ڈاڑھی، اور میری مونچھوں کے کچھ اجزا میں تبادلہ ملکیت ہوگیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عالمِ خواب میں مجسٹریٹ کے متعلق جو الفاظ میں نے کہے تھے اُن کا مخاطب ڈپٹی صاحب نے اپنے آپ کو سمجھا۔ اس کے بعد جب میں اُٹھ کر جھپٹا، تو وہ بھی غصّہ میں آپے سے باہر ہوکر میرے لپٹ گئے۔

پھر جو کچھ ہوا وہ ہوا، اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، ہم دونوں کی حالت اس کا آئینہ تھی۔

میری چیخ سے ڈپٹی صاحب کے چپراسی بھی دالان میں آ گئے، اور یہ تماشا دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے۔ ایک نے بڑی مشکل سے ڈپٹی صاحب کو مجھ سے علیحدہ کیا، اور وہ یہ بڑبڑاتے ہوئے اُٹھے کہ :—

"بازی بازی بار یش بابا ہم بازی"

میں نے کہا کہ :—

ڈپٹی صاحب آپ کو یہ کیا وحشت ہو گئی تھی کہ :-

(یہاں سے پھر صفحات غائب ہیں)

نوٹ - سنہ ۱۹۱۳ء میں انگلستان سے ایک کتاب (Un Common Law.) (غیر معمولی قانون) شائع ہوئی ہے - اس کے مصنف اے - پی - ہربرٹ - ممبر آف پارلیمنٹ ہیں اور کتاب کے "تعارف" لارڈ ایکن - لارڈ ہیوٹ چیف جسٹس انگلستان اور رائٹ آنریبل وائی کونٹ بک ماسٹر لارڈ چینسلر جیسے بڑے لوگوں نے کیے ہیں - اس کتاب میں اُسی قسم کے مقدمات ہیں جیسے اس "ایک نواب صاحب کی ڈائری" میں ہیں - یعنی "مغالطہ" (Fallacy) سے مدد لے کر عجیب و غریب "نتیجے" نکالے گئے ہیں - لیکن بحث کو اس طرح قانونی الفاظ میں لپیٹ دیا گیا ہے کہ بڑی مشکل سے سمجھ میں آتا ہے کہ "نتیجہ" صحیح نہیں نکالا گیا - میرا مضمون اس کتاب کے شائع ہونے سے تقریباً ۱۵ سال پہلے چھپا تھا - مسٹر ہربرٹ کی تعریف کرنے والے کہتے ہیں کہ اس طریقہ کے موجد وہ ہیں - لیکن اگر تعلی نہ سمجھی جائے تو میں کہوں گا کہ "وہ نہیں - میں ہوں"

کل کا گھوڑا

جنابِ اڈیٹر صاحب سالنامہ نمائش!

السلام علیکم، آپ جانتے ہیں کہ آج کل کی نئی پود نے ملک کی بہبودی کے لیے ڈاکہ کو جائز قرار دیا ہے، چنانچہ بنگالہ کی حالت اس کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ اگر یہ اصول صحیح ہے تو میں بھی "بہ پنج نہیں تلّی تو بلّی ہی سہی" کے مقولہ پر عمل کر کے اردو کی خاطر انگریزی ادب پر ڈاکہ ڈالتا ہوں۔ لیکن مال کی ہیئت تبدیل کرنے کے لیے بہت کچھ کتر بیونت کر دیتا ہوں، تاکہ شناخت کی وجہ سے ڈاکہ کا الزام عائد نہ ہو سکے، اگر چوری کا مال خریدنے اور نکاسی کرنے کی ہمت ہے تو بسم اللہ، نمائش میں کسی جگہ جما دیجیے۔ ورنہ واپس فرما دیجیے، خدا کے فضل سے دنیا میں مالِ مسروقہ خریدنے والوں کا توڑا نہیں۔ مال کھرا ہے۔ میں کہیں اور دام کھرے کر لوں گا، دیکھیے ایک راز کی بات بھی

کہے دیتا ہوں، کسی سے کہیے گا نہیں۔ اس مضمون کا
کچھ خاکہ جون ۱۹۰۹ء کے پیرسنز میگزین سے اڑایا گیا ہے۔
لیکن اضافہ واقعات اور طرز ادا نے دونوں مضمونوں
میں زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیا ہے۔ کوئی بے وقوف
سے بے وقوف بھی نہ کہے گا کہ یہ مال فلاں مال کو گلا کر
بنایا گیا ہے۔ پیرسنز میگزین بھی اس کے ساتھ بھیجتا
ہوں، آپ مقابلہ کر کے اپنی عقل کا اندازہ لگا لیجیے۔ والسلام

کمترین مرزا الم نشرح

موجد دنیا میں سیکڑوں ہیں اور ہوتے چلے آئے ہیں، مگر توبہ توبہ
خدا کسی کو میرے دوست مسٹر مور جیسا موجد نہ کرے۔ بندۂ خدا کو
دنیا سے کوئی واسطہ ہی نہ رہا تھا۔ جب دیکھو اپنے دار التجربہ میں بیٹھے
ہیں، جب جاؤ اس کو توڑ اس کو جوڑ رہے ہیں، بیٹھے بیٹھے آندھی
آجاتی تھی، مگر وہ اللہ کا بندہ یہ بھی نہیں پوچھتا تھا کہ میاں خیریت
سے تو ہو، ہزاروں ایجادوں سے دنیا کو مالا مال کر دیا۔ لیکن یہ بھی
نہ سمجھے کہ دنیا ہے کیا بلا۔ اور دنیا میں ہو کیا رہا ہے، جنگِ عظیم میں
ان کی بیسیوں ایجادیں کام میں لائی گئیں، لیکن اُن کو یہ بھی خبر نہ
ہوئی کہ جنگ کب چھڑی! کیوں چھڑی! کون جیتا، کون ہارا، ایک
دن میں نے باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ اس لڑائی میں بلجیم نے اپنی
بساط سے زیادہ ہمت دکھائی، پوچھنے لگے کہ "یہ مسٹر بلجیم کون صاحب
ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔" بھلا ایسوں کی صحبت سے کسی کا کیا
دل بہل سکتا ہے۔

میں تو ٹھیرا بیوپاری، کہ بیسیوں کے لیے مردے کا کفن بھی اتروالوں اور مسٹر مور ٹھیرے ایسے بے پرواکہ اپنی کسی ایجاد کی رجسٹری تک نہ کروائی، میں نے کئی دفعہ کہا بھی، تو یہی جواب ملا کہ ہر ایجاد عامۂ خلائق کے فائدہ کے لیے ہے، کسی خاص شخص کا حق نہیں ہے، اور نہ ٹکے پیدا کرنے کے لیے ہے۔ ایک دوربین ایجاد کی تھی گھر کے باہر سے گھر کے اندر کا حال دکھاتی تھی۔ لیکن میرے یار نے اس کی بھی رجسٹری نہ کرائی، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کارخانہ نے اپنے نام سے اس کی رجسٹری کرا کے لاکھوں روپیہ کھرے کر لیے۔ جب میں نے مور سے اس کا ذکر کیا تو وہ یہ بھی نہ سمجھے کہ اس کارخانہ پر ہرجے کا دعویٰ ہو سکتا ہے۔ بہر حال مور کی ایجادات دریا کی لہریں تھیں کہ یکے بعد دیگرے پیدا ہوتی تھیں، اور بغیر اُن کو فائدے پہنچائے ان کی حد تک فنا ہو جاتی تھیں گو دوسرے اُن سے پوری طرح متمتع ہو جاتے تھے۔ اگر باپ دادا نے جائداد نہ چھوڑی ہوتی تو میرے یار کبھی کے محتاج خانہ پہنچا دیے گئے ہوتے۔ ان کی ذات سے سب ہی کو فائدہ پہنچتا تھا۔ نہ پہنچتا تو مجھ کو، کیونکہ خبر تک نہ ہوتی تھی کہ ان کی کوئی تازہ ایجاد کب مکمل ہوئی اور کب نصیب دشمناں ہوگئی، خود مور سے تو اس کی توقع رکھنی ہی فضول تھی کہ وہ اس کا ذکر مجھ سے کرتے۔ اگر حال کھلتا تھا تو اخباروں سے اور وہ اسے پہنچائے کیا ہونت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت "کی مثل ہمیشہ مجھ پر صادق آتی تھی، اگر میری مالی حالت اچھی ہوتی تو میں پروا بھی نہ کرتا۔ لیکن کاروبار کے مندے اور اکثر بیوپاریوں کی نادہندی

نے مجھ کو ملک کر دیا تھا، ایسی صورت میں آپ انصاف کیجیے کہ اپنے سچے مگر حاجتمند دوست کے ساتھ مور کی یہ بے اعتنائی قابلِ شکایت ہے یا نہیں، ایک دن میں پریشانی کی حالت میں دفتر سے سیدھا مور کے ہاں پہنچا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنے دارالتجربہ میں کچھ کام کر رہے ہیں، وہیں چلا گیا، اُس روز ان کی طبیعت کچھ بشاشں معلوم ہوتی تھی، میرے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر پوچھنے لگے "یہ کیا کتاب ہے؟" میں نے کہا "دلی کے ایک شاعر میر حسن نے ایک مثنوی اردو میں لکھی تھی اُس کا انگریزی ترجمہ ہے" پوچھا "مضمون کیا ہے؟" میں نے کہا "یوں ہی واہی تباہی بکا ہے۔ ایک کل کا گھوڑا بنایا ہے۔ اس پر سوار ہو کر شاہزادہ آسمان پر ہوا خوری کو جایا کرتا تھا۔ غرض اسی طرح کی بے تکی باتیں ہیں" مجھ سے اتنا سنتے ہی مور کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی، آنکھیں چمکنے لگیں اور کہنے لگے "ذرا مجھ کو کل کے گھوڑے والا حصہ تو سناؤ" میں نے کتاب میں سے وہ داستان نکالی اور پڑھنا شروع کیا۔ لیکن پڑھنے میں خلافِ فطرت باتوں کے متعلق شاعر کا مذاق بھی اڑاتا گیا۔ میں پڑھ ہی رہا تھا کہ مور نے نہایت غصیلی آواز سے کہا:—

"او بے ادب خاموش، تجھ جیسا جاہل اس عالی قدر شاعر کو کیا سمجھ سکتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعر ہی نہ تھا بلکہ بجلی کی قوت اور کل پُرزوں کی ترکیب کا بھی پورا ماہر تھا۔ تم جیسوں کے لیے اس کی باتیں مضحکہ خیز ہوں تو ہوں، لیکن سمجھنے والے کے لیے اس کا

ہر نکتہ چراغ ہدایت ہے " یہ سن کر میں دم بخود ہوگیا۔ کیونکہ ڈرتا تھا کہ یہ حضرت کہیں بجلی کے ایک جھٹکے میں میرے جسم کے ذرات بنا کر ہوا میں نہ اڑا دیں۔ اس لیے ٹالنے کے لیے مسکرا کر کہا کہ "اگر تم کو یہ کتاب پسند ہے تو میں چھوڑے جاتا ہوں، میرے کسی کام کی نہیں۔ اس سے کیا بہتر ہے کہ میرے دوست کے کام آجائے"۔ مور نے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی۔ میرا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ اور کہا کہ "یار عزیز اس کتاب نے اس وقت دماغ میں ایک خیال پیدا کر دیا ہے۔ اس کو میں عملی صورت دینا چاہتا ہوں بس اب آپ اپنے گھر سدھاریں، تو بہتر ہے، اچھا خدا حافظ"۔ اس کی یہ اُکھڑی اُکھڑی باتیں سن کر بڑی کوفت ہوئی، اور میں دل میں اس کو صلواتیں سناتا ہوا اپنے گھر چلا آیا۔

چند روز تک میرا مور کے پاس جانا نہ ہو سکا۔ ایک دن جو اُدھر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مور کے دارالتجربہ میں ایک نہایت خوبصورت مشکی گھوڑا کھڑا ہنہنا رہا ہے۔ مجھے مور کے پاس گھوڑا دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ کیونکہ بھلا ایسے شخص کو ایسی چیزوں سے کیا واسطہ، میں خود گھوڑوں کا بہت شوقین ہوں، کوئی گھوڑ دوڑ نہیں ہوتی جس میں اپنا کام ہرج کر کے نہ جاؤں، اس گھوڑے کو جو دیکھا تو بظاہر جاندار پایا۔ پاس جا کر تھپکا، سم دیکھے، بھونریاں دیکھیں، جوڑ دیکھے، غرض ہر طرح بے عیب پایا۔ اتنے میں مور بھی اپنے کسی تجربہ سے فارغ ہو کر میرے پاس آکھڑے ہوئے، میں نے پوچھا "یار من یہ گھوڑا کہاں سے

مار لائے، اور کہاں لاکر رکھا ہے، کہ دارالتجربہ میں۔ کیا خون کا امتحان کر رہے ہو، یا بجلی سے علاج" موور نے بڑے زور سے قہقہہ مارا، اور کہا "یار جانی، یہ وہی میر حسن کی مثنوی والا گھوڑا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اڑ نہیں سکتا، میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ شاعر غضب کا دماغ لے کر آیا تھا۔ پُرزے تو میں نے بھی نکال لیے مگر ان کو بٹھا نہیں سکتا۔ خیر آیندہ دیکھا جائے گا"۔ مجھے موور کی یہ گفتگو بہت بُری معلوم ہوئی۔ گویا ہم کو اندھا بنا رہا ہے۔ میں اُس کو بُرا بھلا کہتا رہا۔ مگر وہ برابر ہنستا رہا۔ آخر کہنے لگا کہ "کیا واقعی تم اس کو اصلی گھوڑا سمجھتے ہو!" میں نے کہا "اور نہیں تو کیا مٹی کا ہے"

موور۔ مٹی کا نہیں تو کل کا ضرور ہے۔

میں۔ تو کیا میں اندھا ہوں۔

موور۔ تو اس کا اندازہ تم خود کرلو۔

یہ کہہ کر اُس نے گھوڑے کے ایک پہلو کو دبایا اور پہلو کا پہلو اٹھا کر دوسری طرف الٹ دیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ گھوڑے کے پیٹ میں ہزاروں تار اِدھر سے اُدھر دوڑے ہوئے ہیں، سینکڑوں پرزے اِس سرے سے اُس سرے تک بیٹھے ہوئے ہیں، اور بیسیوں مقناطیس اور بیٹریاں جا بجا جمی ہوئی ہیں، یہ دیکھ کر میرے ہوش گم ہوگئے، جب ذرا سنبھلا تو پوچھا کہ "موور کیا واقعی یہ گھوڑا دوڑ سکتا ہے"

موور۔ تو کیا میں نے یہ بچوں کا کھلونا بنایا ہے۔ اجی دوڑے گا اور

خوب دوڑے گا۔

میں ۔ اور اس کی انتہائی رفتار۔

مور ۔ اس کا تو میں کوئی صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ لیکن میرے خیال میں کم از کم (۳۰۰) میل فی گھنٹہ ہوگی۔

میں ۔ (۳۰۰) میل!

مور ۔ ہاں (۳۰۰) میل بلکہ کچھ زیادہ۔

یہ سنتے ہی مجھے ٹکے پیدا کرنے کا خیال آگیا۔ اور یہ سوچا کہ اس گھوڑے سے کچھ فائدہ اٹھانا چاہیے۔ میں نے مور پر ڈورے ڈالنے شروع کیے۔ کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ اگر یہ دو تین دوڑیں بھی جیت گیا تو بس میرے دلدّر پار ہیں۔

میں ۔ کیوں یار اسے ڈربی کی گھوڑ دوڑ میں کیوں نہیں دوڑاتے۔

مور ۔ ڈربی کیا بلا ہے؟

میں نے اس کو سمجھانا چاہا مگر گھوڑ دوڑ کا مطلب نہ اس کی سمجھ میں آنا تھا نہ آیا۔ آخر تھک کر میں نے اس سے کہا "اچھا یہ تو بتاؤ اس کی رفتار کم زیادہ ہو سکتی ہے"

مور ۔ یہ بھی ایک ہی کہی، اگر رفتار کم زیادہ نہ ہو سکے تو پھر ایجاد ہی کیا خاک ہوئی۔

میں ۔ خیر یہ تو بتاؤ کہ اس گھوڑے کا تم کرو گے کیا۔ کیا اچار ڈالو گے۔

مور ۔ کچھ نہیں کوئی صاحب آ کر اٹھا لے جائیں گے۔ پھر نہ گھوڑے کو مجھ سے کچھ کام اور نہ مجھ کو گھوڑے سے کچھ غرض۔

میں۔ تو پھر یہ مجھے ہی دے ڈالو۔
مور۔ تم ہی لے جاؤ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ حق بھی تمھارا ہی ہے، تمھاری ہی کتاب سے یہ پیدا ہوا ہے۔ اور تم ہی اس کے سب سے زیادہ مستحق ہو" اندھا کیا چاہے دو آنکھیں میں نے مور سے اس کے چلانے کی پوری ترکیب سیکھ لی۔ گھوڑے کو کمرہ سے نکال سوار ہو کر گھر آیا، اور تھان پر باندھ دیا۔ اس کے ایک دو روز بعد میں مور کے پاس گیا۔ اس گھوڑے کا کچھ ذکر بھی چھیڑا۔ لیکن میرے یار کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس نے ایسا کوئی گھوڑا بنایا بھی تھا، یا نہیں، چلو گئی گذری بات ہوئی۔

میرا ارادہ ہوا کہ ڈربی سے پہلے اس گھوڑے کو دو تین چھوٹی موٹی دوڑوں میں بھگا لوں تاکہ لوگ اس کی حالت سے آگاہ ہو جائیں، اور ایک دفعہ ہی ایسی بڑی دوڑ میں شریک ہونے کے متعلق کوئی ضابطہ کا اعتراض نہ ہو سکے۔ رجسٹر میں گھوڑے کا اندراج کرنے کے لیے گھوڑ دوڑ کے مہتمم نے اس کا نام دریافت کیا۔ یہ ٹیڑھی کھیر تھی، اور میں اس کے لیے تیار نہ تھا۔ لیکن میری تیزی طبع نے اس مشکل کو بہ آسانی رفع کر دیا۔ پہلے میں نے اس کا نام "آدم" بتایا، مہتمم نے ماں اور باپ کا نام پوچھا۔ میں نے کہا کہ آدم کی پیدائش کے لیے ماں باپ کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر جب انھوں نے ضابطہ کی دفعہ بتائی تو مجھے لاچار نام تبدیل کرنا پڑا۔ آخر سوچتے سوچتے "ایجاد" نام سمجھ میں آیا "ضرورت" کو ایجاد کی ماں بنایا۔ اور "تجربہ" کو اس کا باپ، دادا پردادا کا نام

دریافت کیا گیا تو نادر شاہ کے نسب نامہ پر عمل کر کے شمشیر ابن شمشیر ابن شمشیر کی بجائے، ترقی ابن ترقی ابن ترقی کا سلسلہ ستر پشت تک گنوا دیا۔ یہ بیان کافی سمجھا گیا۔ اور "ایجاد" کے نام سے میرے گھوڑے کی رجسٹر ہو گئی۔

اب دوسری مشکل چابک سوار کی تھی، سوار ایسا ہونا چاہیے تھا۔ جس کا نام فہرست چابک سواران میں بھی درج ہو، اور جو لفظ ضمیر اور اس کے مفہوم سے بالکل بے خبر ہو، اور ساتھ ہی قابلِ اعتبار بھی ہو، ظاہر ہے کہ ان صفات کا انسان ملنا آسان نہیں ہے۔ مگر مثل مشہور ہے جو ہندہ یا یندہ، ایک اللہ کے بندے کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکال ہی لیا۔ اس کا نام فہرست میں تو ضرور تھا۔ لیکن مرد میدان نہ تھے دو چار مرتبہ گھوڑ دوڑ میں شریک بھی ہوئے مگر اپنی نا اہلی سے جیتے ہوئے گھوڑوں کو ہرا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روٹیوں کو محتاج ہو گئے۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جس کے کھانے کو رزق اور مرنے کو موت نہ ہو، وہ بے چارہ ضمیر اور اس کے پیچیدہ مسائل کی بحث میں کیوں جانے لگا، قصہ مختصر انھوں نے بلا پس و پیش نہایت خوشی سے میری ملازمت قبول کر لی، مجھے ان کی تمام صفتوں میں اُن کی خاموشی سب سے زیادہ پسند آئی۔ اُن کی خاموشی کا آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تصاویر اُن کی خاموشی پر رشک کرتی تھیں، اور بُت اس دیو جانس کلبی کے سامنے افلاطون اور بسمسرو معلوم ہوتے تھے۔

ان کا نام تو کلیمنٹس، جولیس، آگسٹس جو فری ڈی گیبریلیو تھا۔ لیکن اپنی خاموشی کو نباھنے کے لیے یہ صرف اپنا نام "کل" بتایا کرتے تھے۔ چلو چھٹی ہوئی۔ گھوڑا بھی کل کا، اور چلانے والا بھی مجسّم "کل"۔

میاں بات یہ ہے کہ یہ سب بن پڑے کا سودا ہے۔ جب تقدیر سیدھی ہو جاتی ہے تو سب مشکلیں اپنے آپ کھلتی چلی جاتی ہیں، چند ہی روز میں گھوڑا بھی مل گیا، اور کوڑا بھی مل گیا۔ اب رہ گئی دوڑ، وہ تو پہلے سے جیتی جتائی رکھی تھی۔

غرض اسی طرح دن پر دن گذرتے گئے اور آخر کار گھوڑ دوڑ کا دن آ گیا۔ لیکن اس گھوڑے نے ایسی گم نامی میں پرورش پائی تھی کہ کسی کو کانوں یہ بھی خبر نہ تھی کہ "ایجاد" کیا بلا ہے۔ کس دم کس کا ہے۔ اور اس کے جیتنے کی توقع بھی ہے یا نہیں۔ عین گھوڑ دوڑ کے دن صبح کو مورکی پہلی بے وقوفی کا اظہار ہوا۔ شاید اس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ زین گھوڑے کی کمر پر کسا جاتا ہے۔ اگر معلوم ہوتا تو رفتار بدلنے کے بٹن پیٹھ پر قائم نہ کرتا۔ پہلی رفتار کا تعلق لگام سے رکھا تھا، لیکن بقیہ جس قدر تیز رفتاریاں تھیں ان کے بٹن آگے پیچھے گھوڑے کی پیٹھ پر لگا دیے تھے۔ آخر مسٹر کل نے اس معمہ کو حل کیا اور زین بجائے پیٹھ کے "ایجاد" کے پٹھوں پر کس دیا گیا۔ چونکہ رکابوں کے لیے جگہ نہ تھی، اس لیے ان کو سرے سے اڑا ہی دیا، اور مسٹر کل زین پر اکڑوں بیٹھ کر مقابلہ کے لیے میدان میں اس طرح داخل ہوئے کہ ان کی سوکھی سوکھی ٹانگوں کے گھٹنے اُن کے کانوں سے اوپر نکل گئے تھے۔ کمر دُھری ہو کر کمان

بن گئی تھی، اور وہ گھوڑے کے ہر جھٹکے پر زین سے پھدکتے اور پھر وہیں آ بیٹھتے تھے۔

رغبت اور نفرت دیوانگی کی ابتدائی حالتوں کا نام ہے۔ طبیعت ایک چیز کو بلا وجہ پسند کرتی ہے، اور دوسری کو بلا سبب ناپسند، یہی حالت گھوڑ دوڑ کے گھوڑوں کی ہے۔ بعض گھوڑوں کو محض اس وجہ سے پسند کیا جاتا ہے کہ اُن کے باپ داداؤں نے یہ یہ کارگزاریاں دکھائی تھیں، اور بعض کو اس لیے نظر سے گرا دیا جاتا ہے کہ ان کا سلسلہ نسب حضرت آدم کے گھوڑے تک نہیں پہنچتا۔ میرے بچارے گھوڑے کو اس طوفان بے تمیزی میں کون پوچھتا، اس کی حالت بس اس نواب بوچڑ یا راجہ پنساری کی سی تھی جو پشتینی نوابوں اور راجاؤں کے کسی جلسہ میں آ گیا ہو، کسی نے نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا کہ یہ گھوڑا ہے یا گھوڑی، گدھا ہے یا خچر۔ جب یہ صورت ہو تو بھلا اس چیز کا کون اندازہ کرنے لگا کہ واقعی یہ گھوڑا ہے بھی یا نہیں۔ البتہ مسٹر کل کے طریقہ نشست کا بڑا خاکہ اڑایا گیا۔ مگر اس اللہ کے بندے نے یہ بھی سمجھنے کی کوشش نہ کی کہ یہ فقرے اُس پر کسے جا رہے ہیں یا کسی اور پر۔ شرطوں کی یہ حالت تھی کہ بعض گھوڑوں پر ایک کے دو بھی مشکل سے ملتے تھے۔ مگر "ایجاد" پر ایک ایک کے سَو سَو دینے پر لوگ تیار تھے۔ میں نے بھی اپنی جمع پونجی سب اس شرط پر لگا دی، اور نہایت اطمینان کے ساتھ کرسی پر بیٹھ کر نتیجہ کا منتظر رہا۔ گھنٹی بجی، جھنڈی گری، اور گھوڑے تیر کی طرح نکلے۔ مسٹر کل نے یہ ہوشیاری

کی کہ ایجاد کو شتر بے مہار نہیں کیا۔ بلکہ اس کو نہایت احتیاط سے چلاتا ہوا لایا، اور صرف ناک کی پھننگ سے یہ دوڑ جیتی، ہزاروں کے دیوالے نکل گئے اور میں نے صرف ایک دوڑ میں دس لاکھ روپے سمیٹ لیے، اس میں سے ایک لاکھ روپے تو مسٹر کل کے حصہ میں آئے، اور بقیہ نے میری حالت قابل رشک بنادی۔ تمام دنیا میں اس دوڑ کا چرچا ہوگیا۔ تین اخباروں کے مضامین کے کچھ حصے نقل کرتا ہوں۔ اس سے لوگوں کے خیالات کا اندازہ لگ سکے گا۔

"اخبار گھوڑ دوڑ"

لکھتا ہے "ہم کو معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جو گھوڑا گذشتہ دوڑ میں جیتا ہے وہ سلطان روم کی خاص سواری کا تھا، اور محض اس کی قوت اور کس کا اندازہ کرنے کے لیے تبدیل نام کے ساتھ اس کو اس دوڑ میں شریک کیا گیا تھا۔ ہم نے اپنے قارئین کی اطلاع کے لیے ہزاروں روپیہ خرچ کرکے یہ بھی دریافت کرلیا ہے کہ اس گھوڑے کی نسل کو پوشیدہ رکھنے میں انتہائی کوشش کی جاتی ہے، اور بچہ پیدا ہونے کے بعد ہی ماں اور باپ دونوں کو مار دیا جاتا ہے۔ تاکہ نسل زیادہ نہ بڑھے۔ یہ اب تک پتہ نہ چلا کہ ان گھوڑوں کا جنگل صحرائے عرب کے کس حصہ میں واقع ہے۔ البتہ یہ ضرور معلوم ہو چکا ہے کہ جتنے سائیس اور سوار اس جنگل میں ہیں، اُن کی آنکھیں

پھوڑ دی گئی ہیں، اور زبانیں کاٹ لی گئی ہیں، تاکہ کسی کو اس جنگل کی جائے وقوع معلوم نہ ہو سکے۔ آئندہ جو مزید حالات ظاہر ہوں گے وہ ناظرین کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے پیش کیے جائیں گے۔"

اقتباس از اخبار پنچ

محققین زبان کو یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوگی کہ "دُم پر نمدہ باندھنے" اور "دُم دبا کر بھاگنے" کے محاوروں کی اصلیت کو گذشتہ گھوڑ دوڑ میں ایک نئے گھوڑے "ایجاد" نامی نے ظاہر کر دیا۔

ان دونوں محاوروں کا مفہوم ہمیشہ "بے تحاشا بھاگنا" لیا جاتا تھا۔ لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دُم پر نمدہ باندھنے یا دُم دبانے سے رفتار میں تیزی کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔ اس گھوڑ دوڑ میں "ایجاد" کے زین کا نمدہ یعنی عرق گیر بجائے کمر پر رکھنے کے اس کے پٹھوں پر رکھا گیا، اور واقعی اس طرح کی دُم پر نمدہ بھی آگیا، اور دُم دب بھی گئی اس گھوڑے کا ایسی بڑی دوڑ جیتنا اس کی تیز رفتاری کا بیّن ثبوت ہے۔ ہم اس گھوڑے کے مالک کو ان کی کامیابی پر مبارک باد بھی دیتے ہیں اور لغات کے اہل فن کی جانب سے شکریہ بھی ادا کرتے ہیں کہ ان کے گھوڑوں کی بدولت بہ آسانی دو پیچیدہ محاوروں کی تشریح ہو گئی۔

"مقالہ افتتاحیہ اخبار سائنس"

"رواج اور قدامت پسندی ہمیشہ سے مانع ترقی رہے ہیں،

لیکن بلحاظ اپنی قدامت کے کوئی ایسا رواج ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ جو گھوڑوں پر زین کسنے کے پُرانے طریقہ کا مقابلہ کرسکے۔ تاریخ پر جہاں تک نظر ڈالی جاتی ہے، اور پُرانے کتبوں، تصویروں اور مجسموں کو جہاں تک دیکھا جاتا ہے، یہی پتہ چلتا ہے کہ زین یا چار جامہ ہمیشہ گھوڑوں کی پیٹھ ہی پر ڈالا گیا ہے۔ لیکن اصول سائنس سے اگر اس طریقہ عمل کو دیکھا جائے تو یقیناً پہلی ہی نظر میں یہ بالکل خلاف فطرت معلوم ہوگا، گھوڑے کی بناوٹ ظاہر کر رہی ہے، کہ اس کے پچھلے پٹھے بوجھ سہارنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ نہ کہ اگلی ٹانگیں۔ اگر فطرت کا یہ تقاضا ہوتا کہ پیٹھ پر بوجھ قایم کیا جائے تو گھوڑے کے اگلے اور پچھلے پیر دونوں کی وضع ایک ہی ہوتی تاکہ بوجھ ان چاروں حصّوں پر برابر تقسیم ہو جائے۔ لیکن گھوڑے کی ساخت زبان حال سے بتا رہی ہے کہ اس کے پچھلے پیروں پر بوجھ ڈالو اور اگلے پاٶں رفتار کے لیے چھوڑ دو۔

خود چوپاؤں کے بھاگنے کے طریقہ پر اگر سائنس کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے، تو یہ مسئلہ اور بھی آسانی سے حل ہو جاتا ہے۔ جانور کی چاروں ٹانگیں اگر آگے کو جھکیں گی تو ہمیشہ رفتار میں تیزی پیدا ہوگی۔ اس اصول کو اب واقعات سے منطبق کیجیے۔ جانور کی پیٹھ پر بوجھ رکھنے کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ اس کی پچھلی ٹانگیں تو ضرور آگے کو جھک آتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُس کے اگلے پیر بجائے آگے جھکنے کے پیچھے کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ اور اس سے یقیناً رفتار پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ یہ مسئلہ عرصہ سے ہمارے زیر غور

تھا۔ لیکن ہم اس پر کچھ لکھنے کی ہرگز جرأت نہ کرتے اگر گزشتہ گھوڑ دوڑ میں "ایجاد" نے اس اصول کو عملاً ثابت نہ کر دیا ہوتا۔ کیونکہ ایسے قدیم رواج کے خلاف ایک حرف بھی لکھنا مفت کی لڑائی مول لینا ہے۔ ہم کو امید ہے کہ اب قدامت پسند لوگوں کی آنکھیں سائنس کا عملی تجربہ دیکھنے کے بعد کھلیں گی۔ اور آئندہ گھوڑ دوڑ میں ہم رواج کے مقابلہ میں سائنس کی فتح کو اس شکل میں دیکھیں گے کہ بجائے پیٹھ کے سب گھوڑوں کے پیٹھوں پر زین کسے ہوں گے۔

غرض خدا خدا کر کے ایک ہی گھوڑ دوڑ میں میری مالی حالت درست ہو گئی۔ لیکن اب یہ مصیبت آ پڑی کہ جو سہولتیں "ایجاد" کی گمنامی کی وجہ سے تھیں وہ جاتی رہیں اور اب لوگوں پر یہ ظاہر کرنا پڑا کہ یہ کھاتا، پیتا، لگتا، موتتا ہوا گھوڑا ہے۔ یہ کام بظاہر مشکل تھا مگر میری جدت طبع نے اس کو بھی آسان کر دیا۔ ایک اسی کے قد و قامت، رنگ ڈھنگ، وضع قطع کا گھوڑا راتوں رات خرید لایا۔ اصلی گھوڑے کو تھان پر باندھ دیا۔ اور نقلی کو ایک کمرہ میں بند کر دیا۔ بڑے بڑے ماہرانِ فن آتے اور گھوڑے کو دیکھ کر حیران رہ جاتے کہ کوئی ایسی خوبی نظر نہیں آتی جو اتنی بڑی گھوڑ دوڑ اس کو جتوا سکے۔ نہ تو جوڑ ہی مضبوط ہیں اور نہ بناوٹ ایسی سُبک ہے۔ پھر اس قیامت کی رفتار اس میں پیدا ہو گئی تو کہاں سے پیدا ہو گئی۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ ہر شخص اپنی اپنی ہانکتا تھا، مگر اس عقدہ کو کوئی نہ کھول سکتا تھا۔ آخر ہوتے ہوتے دوسری گھوڑ دوڑ کا دن آ گیا۔ رات ہی کو نقلی اصطبل میں اور اصلی کمرہ میں منتقل کر دیا گیا۔

اور میں اور مسٹر کل گھوڑے کو لے کر عین وقت پر میدان میں پہنچے، کیا دیکھتا ہوں کہ جتنے گھوڑے دوڑنے والے ہیں سب ایک قطار باندھے کھڑے ہیں اور بڑے بڑے حساب داں تقسیم وزن کا لحاظ کر کے ناپ ناپ کر اُن کے پٹھوں پر زین بندھوا رہے ہیں۔ غرض یہ مشکل بھی آسان ہوئی، اور گھنٹہ بجتے ہی سب گھوڑ دوڑ کے لیے ایک صف میں کھڑے ہو گئے۔ اُدھر جھنڈی گری اور اِدھر سواروں نے گھوڑوں کے چابک رسید کیے۔ چابک مارنا تھا کہ قیامت بپا ہو گئی، مارے دولتیوں اور پشتکوں کے گھوڑوں نے سواروں کی جانیں ہلا دیں۔ بعض تو ڈر کر کود گئے۔ بعض ہمت والے تھے وہ جھٹکے جھیلتے رہے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں تماشائیوں کے سروں اور کندھوں پر گٹھریوں کی شکل میں نظر آئے۔ ایک "ایجاد" تھا کہ وہ اول آخر سب ہی کچھ رہا۔ چونکہ اس دوڑ میں لوگوں نے ذرا سمجھ بوجھ کر روپیہ لگایا تھا اس لیے میری آمدنی بھی کچھ زیادہ نہ ہوئی۔ پھر بھی ستر اسّی ہزار میں نے بنا ہی لیے۔

اس واقعہ کے متعلق اخباروں میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں اُن میں سے بعض کا اقتباس ناظرین کے ضیافت طبع کے لیے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

"اخبار گھوڑ دوڑ"

ہم کو سرکاری طور پر اطلاع ملی ہے کہ علاقہ نجد کے کسی نامعلوم مقام پر دو ہوائی جہازوں پر گولیاں برسائی گئیں۔ جس کی وجہ سے

وہ نیچے اترنے پر مجبور ہوئے۔ دونوں جہازوں پر جتنے لوگ سوار تھے ان سب کو نہایت بے دردی سے ذبح کر دیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی مقام کے آس پاس کہیں سُلطانِ روم کے خاصہ کے گھوڑوں کا جنگل ہے۔ ورنہ بلاوجہ جہازوں پر گولیاں چلانے اور اُن کی سواریوں کو ہلاک کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اُمید ہے کہ گورنمنٹ اس اہم معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر صدیوں کے راز کا انکشاف کرے گی۔

پنچ میں ایک نہایت مختصر سا مضمون تھا کہ "اس مرتبہ گھوڑوں کی دموں پر نمدہ باندھا گیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے دوڑ کے وقت بہت سے سواریوں کے چوتڑوں پر نمدہ بندھ گیا اور اکثر سواروں میں اتنی تیزی آگئی کہ وہ اپنے زور میں اُچھل اُچھل کر گھوڑوں کی گردنوں سے آگے نکل گئے۔

اخبار سائنس کا مضمون بہت عالمانہ تھا اُس نے روح پر بحث کر کے لکھا تھا کہ "ماہرانِ فن علم حیوانات اس وقت تک قائل نہ تھے کہ انسان اور حیوان دونوں میں ایک ہی قسم کی روح ہوتی ہے اور اِسی لیے حیوانوں میں بھی رواج اور قدامت پسندی اسی طرح جاری اور ساری ہے جس طرح انسانوں میں ہے۔ اِس مسئلہ کا تصفیہ گذشتہ گھوڑ دوڑ نے نہایت اطمینان بخش طریقہ پر کر دیا اور اب کسی کو اس کے خلاف زبان ہلانے کی گنجایش نہیں رہی۔ رواج قدیم کے خلاف مگر اصولِ سائنس کے موافق اس گھوڑ دوڑ میں زین بجائے پیٹھ پر رکھنے کے گھوڑوں

کے پٹھوں پر کسا گیا تھا۔ گو اس طریق عمل سے ان جانوروں کو زیادہ آسائش و سہولت تھی۔ لیکن رواج قدیم کے خلاف ہونے کی وجہ سے اُنھوں نے بطور احتجاج دولتیاں جھاڑنا اور سینگیں مارنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان گھوڑوں کی بیوقوفی کے باعث پھر "ایجاد" نامی گھوڑا جو اصول سائنس کو سمجھتا اور اپنی آسائش کا احساس رکھتا تھا بازی لے گیا۔ لیکن وہ زمانہ کچھ دور نہیں ہے جب یہ جانور بھی اپنی ضد سے باز آئیں گے اور اپنی قدامت پسندی کو اسی طرح ترک کر دیں گے جس طرح گذشتہ گھوڑ دوڑ کے بعد سے انسانوں نے ترک کر دیا ہے۔"

اب ڈربی کا نازک زمانہ قریب آگیا اور "ایجاد" کے ٹکٹوں کی قیمت چڑھنا شروع ہوئی نوبت یہاں تک پہنچی کہ روپے پر ایک آنہ بھی کوئی دینے پر تیار نہ تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں ایک دوسرے خلجان میں پڑ گیا۔ جو لوگ گھوڑ دوڑ کے فن سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایک گھوڑے کے نکل جانے سے شرطوں میں زمین آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے۔ اس لیے بعض بے ایمان لوگ ایسے بھی نکل آتے ہیں جو گھوڑوں کو زہر دینے یا اصطبل کو بم سے اُڑا دینے میں تامل نہیں کرتے۔ باوجود میری حفاظتی تدابیر کے ایک روز رات کے بارہ بجے میرا اصطبل مع اصلی گھوڑے کے بم سے اُڑا دیا گیا۔ اور بیچارے ناکردہ گناہ کے پھیپھڑے اور کمال کے ٹکڑے کئی کئی میل کے فاصلہ پر پائے گئے۔ لیکن شکر ہے کہ میرا "ایجاد" اس حملہ سے محفوظ رہا اور دوسرے ہی دن صبح کو اس

واقعہ کا حال اخباروں میں بڑے بڑے موٹے موٹے حروفوں میں چھپ گیا۔ اور چھپنے کے ساتھ ہی "ایجاد" کے ٹکٹوں کی قیمت گر گئی۔ میرے لیے یہ "خدا شرے برانگیزد کہ خیرے ما درآں باشد" کا مصداق ہو گیا۔ اور میں نے دل کھول کر ٹکٹ خریدنا شروع کیے۔ ہزاروں تار تعزیت کے آئے مگر میں نے ایک کا بھی جواب نہ دیا۔ لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ میں مرے گھوڑے کے ٹکٹ کیوں خرید رہا ہوں۔ لوگوں میں بہت کچھ چہ میگوئیاں بھی ہوئیں اور آخر انھوں نے پتہ چلا لیا کہ "ایجاد" میرے سونے کے کمرے میں صحیح سلامت موجود ہے۔

ڈربی سے ایک دن پہلے میں اور مسٹر کل اپنے کمرے میں کھڑے گھوڑے کی دیکھ بھال کر رہے تھے کہ سامنے کی کھڑکی میں سے پستول چلا اور گولی "ایجاد" کے پہلو میں لگ کر آر سے پار ہو گئی۔ میں کھڑکی سے کود کر اس شخص کے پیچھے بھاگا۔ لیکن وہ ہاتھ نہ آیا۔ پولیس میں اطلاع دینا گویا اپنا راز کھول کر خود کو تباہ کر لینا تھا۔ اس لیے خاموشی اختیار کی۔ واپس آکر میں نے اور مسٹر کل نے "ایجاد" کے پرزوں کو اچھی طرح دیکھا بھالا۔ لیکن کوئی خرابی نظر نہ آئی۔ اور ہم نے "رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت" کا ورد کر کے ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی۔ میں "ایجاد" کے مالک کی حیثیت سے تو تمام دنیا میں مشہور ہو گیا تھا۔ لیکن دل چاہتا تھا کہ "ایجاد" پر سوار ہو کر اور خود ڈربی جیت کر اپنی شہرت کو چار چاند لگاؤں۔ اس لیے میں نے تہیہ کر لیا کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس مرتبہ تو

میں ہی اس پر سوار ہونگا۔ سٹرکل نے منع بھی کیا۔ لیکن میں نے ایک نہ مانی اور صبح ہی سے تیاری شروع کر دی۔

ڈربی کے میدان میں پہنچا تو دل ہیبت سے کانپ گیا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ خود بادشاہ سلامت بھی مع خاندانِ شاہی کے رونق افروز تھے۔ تمام گھوڑے یکے بعد دیگرے ان کے سامنے سے گذارے گئے۔ جب "ایجاد" میدان میں آیا تو تالیوں کی آواز سے آسمان گونج گیا۔ میں نے بھی خراماں خراماں گھوڑے کو میدان کا چکر دیا۔ اور سب گھوڑوں میں ملا کر کھڑا کر دیا۔ گھنٹہ بجا۔ جھنڈی گری۔ اور سب گھوڑے آندھی کی طرح رواں ہوئے۔ مگر "ایجاد" نے بے تحاشا بدکنا شروع کیا۔ ایک تو غصہ دوسرے شرمندگی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ پورے زور سے تیز رفتاری کا بٹن دبا دیا۔ جس وقت بٹن دبایا تو اس کے منہ کے بجائے اس کی پیٹھ میدان کی طرف تھی۔ میری حیرت کی کچھ انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ "ایجاد" نے پوری رفتار کے ساتھ اُلٹے پاؤں بھاگنا شروع کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رات والی گولی نے لگام والی رفتار کے پُرزے کو تو کوئی ضرر نہیں پہنچایا تھا۔ مگر تیز رفتاری کے پُرزوں کے عمل کو بالکل بدل دیا تھا۔ میں نے گھوڑے کو روکنا چاہا۔ تو پسینے چھوٹ گئے کیونکہ میرے زور سے دبانے کی وجہ سے بٹن دب کر ٹوٹ گیا تھا۔ اب کیا تھا۔ گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا اور تھوڑی دیر میں دوسرے گھوڑوں کو جا لیا۔ اور آنِ واحد میں ان سے آگے نکل گیا۔ گو یہ گھوڑے آگے بڑھ رہے

تھے۔ مگر میرے اُلٹی رفتار کے باعث پیچھے ہٹتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اور گو میں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ لیکن دراصل ان سے آگے بڑھا جاتا تھا۔ لوگوں کے قہقہوں اور تالیوں نے صور اسرافیل کی صورت پیدا کر لی۔ اور بعض سواروں کو ہنسی کی وجہ سے اپنے گھوڑوں کو روکنا پڑا۔ واقعہ کے بیان کرنے میں عرصہ لگا ہے۔ لیکن خود یہ واقعہ شروع ہوا اور آناً فاناً میں ختم ہو گیا۔ اور ڈربی کی تاریخ میں یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ جیتنے میں کسی گھوڑے کا حساب سر کی لمبائی سے لگانے کی بجائے دُم کی لمبان سے لگانا پڑا۔

اب مشکل یہ آپڑی کہ گھوڑا نہ اب رکتا ہے نہ جب۔ میدان کو عبور کر کے باڑھ توڑتا ہوا تماشائیوں میں گھُس گیا۔ جدھر نکل گیا کائی سی پھٹ گئی، بھیڑ چھٹ گئی اور میدان صاف ہو گیا۔ اب میں کیا کروں۔ رفتار ایسی تیز تھی کہ کودنے کی ہمّت نہ پڑتی تھی میں نے دیکھا کہ دور ایک خالی موٹر کھڑی ہے۔ جب گھوڑا اُس کے پاس نکلا میں اللہ کا نام لے دھم سے موٹر میں کود پڑا۔ اب رہے میاں "ایجاد" تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کا کیا حشر ہوا۔ البتہ دوسرے روز کے اخبار میں ہوائی خبر سے یہ ضرور معلوم ہوا کہ ایک گھوڑا اُلٹا تیرتا ہوا افریقہ کے جنوبی کنارے پر دیکھا گیا۔ اخبار گھوڑ دوڑ کا خیال ہے کہ فطرت اس کو اپنے مسکن کی طرف لے جا رہی ہے لیکن پنچ کی رائے ہے کہ جب تک اُس کی دُم پر نمدہ بندھا رہے گا اس کی رفتار کم نہ ہوگی۔ اب آپ ہی بتائیے کہ دونوں میں کون سچا ہے۔ میرے چوٹ تو آئی مگر سمجھا چلو جان بچی لاکھوں

پائے۔ لنگڑے ہو گئے تو کیا ہرج ہے ڈربی تو جیت لی۔ بدصیامری تو مری آگرہ تو دیکھ لیا۔

هم
اور
ہمارا امتحان

جناب ایڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم۔ ذوق مرحوم فرما گئے ہیں:۔

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات ۔ ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

بعض انسان دُنیا کے تاریک پہلو کو دیکھتے ہیں اور بعض پہلو کو۔ ایک ہی چیز ایک کو بُری معلوم ہوتی ہے اور دوسرے کو اچھی۔ امتحان ایک کے لیے آفت جان ہوتا ہے۔ اور دوسرے کے لیے دلفریب۔ ان ہی دو رخوں کو دو صاحبوں نے اپنی اپنی سرگزشت میں دکھایا ہے۔ اس کے روشن رُخ کا کچھ حصّہ رسالہ افادہ میں چھپا تھا۔ مگر وہ رسالہ کے حق میں غالب کا قصیدہ ہو گیا۔ اور اس کی اشاعت کے ساتھ ہی رسالہ افادہ کا خاتمہ بالخیر ہو گیا۔

اب یہ دونوں رُخ رسالہ نمایش کے لیے بھیجتا ہوں۔ دونوں کو ایک ہی پرچہ میں چھاپ دیجیے۔ تاکہ آپ کے رسالہ کا حشر بھی اس کی نحوست سے کہیں وہ نہ ہو جو رسالہ افادہ کا ہوا۔ اگر چھاپنے کی ہمت نہ ہو مضمون واپس کر دیجیے۔ جو ایڈیٹر صاحب اپنے رسالہ کی بنیاد کو بہت قوی سمجھتے ہیں ان کو بھیج دونگا۔ دیکھوں وہ بھی اس ٹکر کی تاب لاتے ہیں یا نہیں۔ والسلام

(مرزا الم نشرح)

تصویر کا ایک رُخ

نہ ہوئی گر مرے پرچوں سے تسلی نہ سہی　　امتحاں اور بھی باقی ہے تو یہ بھی نہ سہی

لوگ امتحان کے نام سے گھبراتے ہیں لیکن مجھے ان کے گھبرانے پر ہنسی آتی ہے۔ آخر امتحان ایسا کیا ہوا ہے۔ دو ہی صورتیں ہیں۔ "فیل یا پاس" اس سال کامیاب نہ ہوئے آئندہ سال سہی۔ میں اپنے دوستوں اور ہم جماعتوں کو دیکھتا تھا کہ جوں جوں امتحان کے دن قریب آتے جاتے ان کے حواس پراں۔ ان کا دماغ مختل اور ان کی صورت اتنی سی نکل آتی تھی۔ بندہ درگاہ پر امتحان کا نہ رتی برابر اثر پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ گو امتحان سے فارغ ہو چکا ہوں۔ لیکن اب بھی اس کے ختم ہو جانے کا افسوس ہے۔ اُمید واروں کا مجمع۔ نئی نئی صورتیں۔ عجیب عجیب خیالات۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے کبھی دل سیر نہیں ہو سکتا۔ جی چاہتا ہے کہ تمام عمر امتحان ہوئے جائے۔ لیکن پڑھنے اور یاد کرنے کی شرط اُٹھا دی جائے۔ میری سنیئے کہ دو سال میں لا کلاس کا کورس پورا کیا۔ مگر کس طرح؟ شام کو یاروں کے ساتھ ٹہلنے نکلتا۔ واپسی کے وقت لا کلاس میں بھی جہاں تک آ جاتا۔ منشی صاحب دوست تھے۔ اور لکچرار صاحب پڑھانے میں مستغرق حاضری کی تکمیل میں کچھ دشواری نہ تھی۔ اب آپ ہی بتائیے کہ لا کلاس میں شریک ہونے سے میرے کس مشغلہ میں فرق آ سکتا تھا؟ والد صاحب قبلہ خوش تھے کہ بیٹے کو قانون کا شوق ہو چلا ہے، کسی زمانہ میں بڑے بڑے وکیلوں

کے کان کترے گا۔ ہم بھی بے فکر تھے کہ چلو دو برس تک تو کوئی محنت کے لیے کہہ ہی نہیں سکتا۔ بعد میں دیکھیے کون جیتا ہے اور کون مرتا ہے۔ لیکن زمانہ آنکھ بند کرتے گذر جاتا ہے۔ دو سال ایسے گذر گئے جیسے ہوا۔ لا کلاس کا صداقت نامہ بھی مل گیا۔ اب کیا تھا۔ والدین امتحان وکالت کی تیاری کے لیے سر ہو گئے۔ مگر میں بھی ایک ذاتِ شریف ہوں۔ ایک بڑھیا اور ایک بڈھے کو دھوکا دینا کیا بڑی بات ہے۔ میں نے تقاضا کیا کہ علیحدہ کمرہ مل جائے تو محنت کروں۔ بال بچوں کی گڑبڑ میں مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ چند روز اسی حیلے سے ٹال دیے۔ لیکن تابکے! بڑی بی نے اپنے سونے کا کمرہ خالی کر دیا۔ اب میں دوسری چال چلا۔ دروازوں میں جو شیشے تھے اُن پر کاغذ چپکا دیا۔ لیمپ روشن کر کے آرام سے سات بجے سے سو جاتا اور صبح نو بجے اُٹھتا۔ اگر کسی نے آواز دی اور آنکھ کھل گئی تو ڈانٹ دیا کہ خواہ مخواہ میری پڑھائی میں کیوں دخل ڈالا جاتا ہے۔ اگر آنکھ نہ کھلی اور صبح کو سونے کا الزام لگایا گیا! تو کہہ دیا کہ میں پڑھتے وقت کبھی جواب نہ دوں گا۔ آئندہ کوئی مجھے دق نہ کرے۔ بعض وقت ایسا بھی ہوا کہ لیمپ بھڑک کر چمنی سیاہ ہو گئی۔ اور میری زیادہ محویت و محنت کا نتیجہ سمجھی گئی۔ بعض وقت والد والدہ کہتے بھی تھے کہ اتنی محنت نہ کیا کرو۔ لیکن میں زمانہ کی ترقی کا نقشہ کھینچ کر اُن کا دل خوش کر دیا کرتا تھا۔ خدا خدا کر کے یہ مشکل بھی آسان ہو گئی۔ اور امتحان کا زمانہ قریب آیا۔ میں نے گھر میں بہت کہا کہ ابھی میں امتحان کے لیے جیسا چاہیے ویسا تیار نہیں ہوں۔ لیکن میری مسلسل حاضری لا کلاس

اور شبانہ روز کی محنت نے اُن کے دلوں پر سکّہ بٹھا رکھا تھا۔ وہ کب
ماننے والے تھے پھر بھی احتیاطاً اپنے بچاؤ کے لیے اُن سے کہہ دیا کہ اگر
میں فیل ہو جاؤں تو اس کی ذمّہ داری مجھ پر نہ ہو گی۔ کیونکہ میں
اپنے آپ کو ابھی امتحان کے قابل نہیں پاتا۔ لیکن والد صاحب مُسکرا کر
بولے کہ امتحان سے کیوں ڈرتے جاتے ہو۔ جب محنت کی ہے تو شریک
بھی ہو جاؤ کامیابی و ناکامیابی خدا کے ہاتھ ہے۔ ع

مرد باید کہ ہراساں نہ شود

میں نے بھی تقدیر اور تدبیر پر ایک چھوٹا سا لکچر دے کر
ثابت کر دیا کہ تدبیر کوئی چیز نہیں۔ تقدیر سے تمام دنیا کے کام
چلتے ہیں۔

قصّہ مختصر درخواست شرکت دی گئی اور منظور ہو گئی۔ اور
ایک دن وہ آیا کہ ہم ہال ٹکٹ لیے ہوئے مقام امتحان پر پہنچ ہی
گئے۔ گو یاد نہیں کیا تھا لیکن دو وجہ سے کامیابی کی اُمید تھی "اول
تو امداد غیبی" دوسرے "پرچوں کی اُلٹ پھیر" شاید وہ حضرات جو
امتحان میں کبھی شریک نہیں ہوئے اس مضمون کو نہ سمجھیں۔ اس
لیے ذرا وضاحت سے عرض کرتا ہوں۔ " امداد غیبی" سے مراد امیدواران
امتحان کی اصطلاح میں وہ مدد ہے جو ایک کو دوسرے سے یا کسی
نیک ذات نگراں کار سے یا عندالموقع کتاب سے پہنچ جاتی ہے۔
پرچوں کی اُلٹ پھیر گو بظاہر مشکل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن تقدیر
سب کچھ آسان کر دیتی ہے۔ بعض شریف کم حیثیت ملازم ایسے
بھی نکل آتے ہیں جو بامید انعام پرچے بدل دیتے ہیں۔ یہ ضرور

ہے کہ اس سے ایک محنت کرنے والے کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ لیکن تدبیر و تقدیر کا مسئلہ جیسا اِس کارروائی میں حل ہوتا ہے۔ دوسری کسی صورت میں حل نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اور بھی صورتیں ہیں۔ لیکن وہ بہت کم پیش آتی ہیں۔ اس لیے اُن پر بھروسہ کرنا نادانی ہے۔

خیر آمدم بر سرِ مطلب! پونے دس بجے گھنٹی بجی اور ہم بسم اللہ کہہ کر کمرۂ امتحان میں داخل ہوئے۔ یہاں ایک بہت خلیق اور ہنس مکھ نگراں کار تھے۔ مجھے جگہ نہیں ملتی تھی۔ میں نے ان سے کہا۔ وہ میرے ساتھ ہو لیے۔ جگہ بتائی اور بڑی دیر تک ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے۔ میں سمجھا چلو بیڑا پار ہے۔ اللہ دے اور بندہ لے۔

ٹھیک دس بجے پرچہ تقسیم ہوا۔ میں نے پرچہ لیا۔ سرسری نظر ڈالی اور میز پر رکھ دیا۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ پرچہ پڑھنے کے بعد جیسا میرے چہرے پر اطمینان تھا۔ شاید ہی کسی کے چہرہ پر ہوگا۔ خود تو اس پرچے کے متعلق اندازہ نہ کرسکا لیکن نگراں کار صاحب کو یہ کہتے ضرور سُنا کہ پرچہ مشکل ہے۔ میں کئی مرتبہ اوّل سے آخر تک اس کو پڑھ گیا۔ لیکن یہ نہ معلوم ہوا کس مضمون کا ہے۔ جوابات کی کاپی دیکھی۔ اس کے آخر کی ہدایتیں پڑھیں۔ صفحہ اوّل کی خانہ پوری کی اور کھڑا ہوگیا۔ گارڈ صاحب فوراً ہی آئے۔ میں نے اُن سے کہا کہ جناب یہ پرچہ کس مضمون کا ہے، وہ مسکرائے، زبان سے تو کچھ نہ بولے مگر پرچے کے عنوان پر اُنگلی رکھ دی۔ اُس وقت مجھے معلوم ہوا کہ "اصول قانون" کا پرچہ ہے۔ دل کھُل گیا۔ اب کیا تھا۔ میں نے بھی قلم اُٹھا کر لکھنا شروع کردیا۔ کیونکہ اصول کے لیے کسی کتاب کے پڑھنے کی ضرورت تو ہے ہی

نہیں۔ اس مضمون پر ہر شخص کو رائے دینے کا حق حاصل ہے۔ ایک مقنن ایک اصول قایم کرتا ہے دوسرا اس کو توڑ دیتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ہم اپنی رائے کو کسی دوسرے کی تجویز کا پابند کریں۔ میں نے اپنے برابر والے صاحب سے پوچھنے کی کوشش بھی کی۔ کچھ ادھر ادھر نگاہ بھی دوڑائی۔ مگر گارڈ صاحب میری حالت کو کچھ ایسا تاڑ گئے تھے کہ ہر وقت بلائے ناگہانی کی طرح سر پر ہی کھڑے رہتے تھے۔ ذرا میں نے اِدھر اُدھر گردن پھیری اور اُنھوں نے آواز دی کہ "جناب اپنے پرچے پر نظر رکھیے۔"

جب دوسروں سے مدد ملنے کی توقع منقطع ہو گئی۔ تو میں نے دل میں سوچا کہ چلو ان گارڈ صاحب ہی سے پوچھیں۔ میں کھڑا ہو گیا۔ وہ آئے میں نے دریافت کیا کہ "جناب اس دوسرے سوال کا کیا جواب ہے۔" وہ مسکرائے اور سمجھا کہ "مجھے معلوم نہیں۔" میں نے کہا کہ یہ برابر والے بڑے زور سے لکھ رہے ہیں ان سے پوچھ دیجیے۔ اور اگر آپ کو دریافت کرتے ہوئے لحاظ آتا ہے تو ذرا اُدھر ٹہلتے ہوئے تشریف لے جائیے میں خود پوچھ لوں گا۔" مگر وہ کب ملنے والے تھے۔ قطب ہو گئے ان کا مسکرانا پہلے تو اچھا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن پھر آخر میں تو زہر گیا، میں واللہ سچ کہتا ہوں کہ اگر تمام عمر میں قلبی نفرت مجھے کسی سے ہوئی ہے تو اُنھی صاحب سے ہوئی ہے۔ ان کا وہ مسکراتے ہوئے ٹہلنا مجھے ایسا بُرا معلوم ہوتا تھا کہ کئی دفعہ میں نے ارادہ کیا کہ اگر میرے برابر کھڑے ہو کر یہ مسکرائے تو ضرور گلنچ ہو جاؤں لیکن پھر سوچا کہ سرکاری معاملہ ہے کہیں انجن چھوڑ کر

گھسیٹن میں نہ پڑ جاؤں۔ اس لیے چپکا ہو رہا۔ غرض اس طرح یہ تمام دن امتحان سے گذر گئے۔ لیکن آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے ظالم کے ساتھ ایسی حالت میں کہ ایک حرف بھی یاد نہ ہو پورے چھ گھنٹے گزارنے کیسے مشکل ہوں گے۔ میں تو ہر روز آدھ گھنٹے کے بعد ہی کمرے سے نکل آتا لیکن مصیبت یہ آن پڑی کہ والد صاحب روز گیارہ بجے سے آجاتے اور نیچے صحن میں بیٹھے رہتے۔ اب میں جلدی باہر آجاتا تو جو رعب میں نے دو سال کے عرصہ میں قایم کیا تھا وہ سب ہوا ہو جاتا۔ اس لیے قہر درویش۔ برجانِ درویش۔ آخری وقت تک کمرۂ امتحان میں بیٹھا رہتا اور جب نیچے اُترتا تو والد صاحب سے پرچے کی سختی کی ضرور شکایت کرتا۔ وہ بھی میری تشفی کے لیے ممتحن کو بہت کچھ بُرا بھلا کہتے۔ لیکن اُن کو یہ خیال ہو گیا تھا کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو میرا بیٹا کامیاب ضرور ہوگا۔ امتحان ختم ہوا۔ اور امید نمبر ایک اور دو کا خون ہو گیا۔ اب ممتحنوں کے پاس کوشش کی سوجھی۔ والد صاحب ایک زبردست چٹھی سفارش کی لے کر ایک صاحب کے یہاں پہنچے۔ وہ چٹھی دیکھ کر بہت اخلاق سے ملے۔ آنے کی وجہ دریافت کی۔ والد نے عرض کیا کہ خادم زادہ اس سال امتحان میں شریک ہوا ہے اگر آپ کوشش فرمائیں تو یہ خانہ زاد ہمیشہ ممنونِ احسان رہے گا۔ وہ بہت ہنسے اور دوسرے لوگوں سے جو سلام کو حاضر ہوئے تھے فرمانے لگے۔ یہ عجیب درخواست ہے ان کا بیٹا تو امتحان دے اور کوشش میں کروں۔ بندۂ خدا اپنے لڑکے سے کہو کہ وہ خود کوشش کرے۔ بیچارے بڑے میاں ایسے نادم ہوئے کہ پھر

کسی کے پاس نہ گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد نتیجہ بھی شائع ہو گیا۔ اور کمترین جملہ مضامین میں بدرجۂ اعلیٰ فیل ہوا۔ خبر نہیں کہ وہ کونسے بھلے مانس ممتحن تھے کہ اُنھوں نے دو نمبر دے دیے۔ باقی نے تو صفر ہی پر ٹالا۔ والد صاحب کو بہت رنج ہوا۔ نمبروں کی نقل حاصل کی۔ اور بالآخر یہی رائے قرار پائی کہ کسی بدمعاش چپراسی نے پرچے بدل دیے ورنہ ممکن تھا کہ برابر تین گھنٹے لکھا جاتا اور صفر ملتا۔ مجھے تعجب تھا کیونکہ میں نے پرچے کچھ ایسے بُرے نہیں کیے تھے۔ فیصلہ کے دو پرچوں کے جوابات تو مجھے کچھ یاد ہیں۔ وہ ناظرین کے سامنے پیش کرکے ان سے انصاف کا طالب ہوں۔ بقیہ پرچوں کے متعلق مجھے خود یاد نہیں رہا کہ سوال کیا تھا۔ اور میں نے جواب کیا لکھا۔ لیکن میرے فیصلہ سے دوسرے جوابات کا اندازہ ہو جائے گا۔ فیصلہ دیوانی میں یہ مقدمہ دیا گیا تھا۔ کہ ایک مکان گروی ہے مرتہن کہتا ہے کہ مکان رہن بالوفا تھا، مدت ختم ہو گئی اس لیے مکان اب میرا ہو گیا۔ راہن کہتا ہے کہ مرتہن کا قبضہ غاصبانہ ہے۔ دونوں طرف سے شہادت پیش ہوئی ہے۔ مرتہن کے گواہوں کے بیانات سے میری رائے میں رہن بالوفا ثابت تھا۔ اور راہن کی شہادت سے قبضہٗ غاصبانہ۔ میں نے اس کا تصفیہ یہ کیا کہ مکان منہدم کرکے زمین اور عملہ آدھا آدھا دونوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اور چونکہ یہ تمام خرابی گواہوں کے بیہودہ بیانات سے پڑی ہے اس لیے مکان کے منہدم کرنے اور مقدمہ کا خرچہ اُن سے دلایا جائے۔ میں اب بھی نہایت زور سے کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ صاف کوئی فیصلہ نہیں

ہوسکتا۔ نہ مرتہن کو شکایت کہ میرا مقدمہ خارج ہوا۔ اور نہ راہن کو شکایت کہ اُس کا مکان مفت میں دوسروں کو دے دیا گیا۔ اب اس فیصلہ پر بھی اگر ممتحن صاحب نمبر نہ دیں تو وہ جانیں اور اُن کا دین ایمان جانے۔

فوجداری مقدمہ کی یہ صورت تھی کہ ایک جوان عورت کے خاوند کو ملزم نے مار ڈالا تھا۔ بیچاری کے دو چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ شہادت میں جو گواہ پیش ہوئے اُنھوں نے بیان کیا کہ ہم نے ملزم کو قتل کرتے ہوئے خود دیکھا ہے۔ ایک بیان کرتا ہے کہ اُس کا مُنہ شمال کی طرف تھا۔ دوسرا کہتا ہے کہ میرا مُنہ جنوب کی طرف تھا۔ ذرا انصاف کیجیے کہ جب یہ صورت ہے تو اس کا لازمی نتیجہ ہوا کہ ان دونوں کی پیٹھ ملزم اور مقتول کی طرف تھی۔ اول تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا بڑا واقعہ ہو رہا ہو اور یہ لوگ پیٹھ پھیرے کھڑے رہیں۔ دوسرے جب یہ پیٹھ پھیرے کھڑے تھے تو کیا ان کی پیٹھ پر آنکھیں تھیں جو اُنھوں نے اس واقعہ کو دیکھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں جھوٹے ہیں۔ اس لیے میں نے یہ تجویز کی کہ ان دونوں گواہوں کو دو سال سزائے قید با مشقت اور سو سو روپیہ جرمانہ کی سزا دے کر ملزم کو بری کر دیا۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ بیچاری مستغیثہ بیوہ ہو گئی۔ اس لیے اس کے متعلق یہ حکم دیا کہ سرکاری طور پر مستغیثہ کا نکاح ملزم سے کر دیا جائے اور جو رقم جرمانہ گواہوں سے وصول ہو وہ اس نکاح میں صرف کی جائے۔ اب رہے بچے تو ان کے متعلق یہ تجویز کی گئی کہ ملزم کو ان کے رکھنے اور پرورش

کرنے میں تامل ہوگا۔ اس لیے دونوں یتیم خانہ میں بھیج دیے جائیں۔
اب آپ ہی فرمائیے کہ اس سے زیادہ اور کیا انصاف ہوسکتا ہے۔
اس پر بھی اگر ممتحن صاحب مجھ کو فیل کردیں تو اس کو ظلم نہ کہیں تو
اور کیا کہیں گے انصاف آپ ناظرین کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے یہ
جوابات والد صاحب کو بھی سنائے انھوں نے بہت تعریف کی
ممتحنوں کو بہت برا بھلا کہا۔ میری بہت اشک شوئی کی اور فرمایا
بیٹا کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ اس سال نہیں آیندہ سال سہی۔
آخر کہاں تک بے ایمانی ہوگی۔ سو دن چوسکے تو ایک دن شاہ کا۔ خیر ع
رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت
جو کچھ ہوا سو ہوا ایک سال کی فرصت تو مل گئی۔

تصویر کا دوسرا رُخ

بلا بلغظ عرب امتحان بود یعنی   کہ بندہ را بہ بلا امتحاں کند داور
بخدا امتحان بڑی سخت چیز ہے۔ خدا کسی کو امتحان میں نہ ڈالے۔
میرا تو یہ حال ہے کہ جب امتحان کا خیال آجاتا ہے تو بدن پر رونگٹے
کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اور جو جو مصیبتیں اس امتحان کے زمانہ میں مجھ پر
گزریں۔ وہ سب نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔ میرا دل اپنے امتحان کے
واقعات لکھتے ہوئے کانپتا ہے۔ مگر چند محبوں اور محسنوں کا اصرار ہے
اس لیے مختصراً عرض کرتا ہوں۔
کسی زمانہ میں ہم لوگ بھی بڑے سمجھے جاتے تھے لیکن زمانہ کی

گردش نے رفتہ رفتہ اچھی طرح پیس دیا۔ اور ایک وہ زمانہ آگیا کہ
ہمارے رشتہ دار بھی ہم سے تعلق ظاہر کرنے میں اجتناب کرنے لگے۔
والد صاحب قبلہ مرحوم کے زمانۂ حیات تک کسی نہ کسی طرح گزرے جاتی
تھی لیکن مرحوم کی فراخ دستی اور اثاثہ کی کمی نے افلاس کی آخری
حد تک ہم کو پہنچا دیا تھا۔ اُن کے انتقال کے وقت میری عمر سترہ
سال کی تھی۔ انٹرنس کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ لا کلاس کا پہلا
سال بھی ختم نہ ہوا تھا کہ یکایک انفلوئنزا میں ان کا انتقال ہو گیا۔
تمام گھر بیمار پڑا۔ بیماری کے اخراجات نے رہا سہا اور بھی
ٹھکانے لگا دیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب سب بیماری سے
اُٹھے تو رہنے کا مکان بھی فروخت کرنا پڑا۔ ایک چھوٹا سا مکان
(عہ) کرایہ سے لے کر جا رہے۔ گھر میں میری والدہ صاحبہ تھیں۔
میں اور میری چھوٹی بہن رضیہ۔ اس کی عمر پانچ سال کی تھی۔
والدہ کے پاس سلائی کا کچھ کپڑا آجاتا۔ اُس سے اور تھوڑا بہت
جو زیور رہا تھا اس کو بیچ بیچ کر گزارہ کرتے۔ جب آمدنی کم اور خرچ
زیادہ ہو تو قارون کا خزانہ بھی کافی نہیں ہوتا۔ تھوڑے دنوں
میں جو کچھ رہا سہا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ اس عرصہ میں میری لا کلاس
کی مدت بھی ختم ہو گئی۔ اور امتحان کا زمانہ قریب آگیا۔ اب سب
سے بڑی مشکل فیس کی تھی کوئی ایسی چیز پاس نہ تھی کہ گروی رکھ کر
یا بیچ کر یہ رقم ادا کی جاتی۔ کوئی ایسا ہمت والا رشتہ دار نہ تھا
کہ صرف بھروسہ پر یہ پچاس ساٹھ روپے کی رقم دیتا۔ رضیہ کے
پاس گلے میں ایک ہنسلی اور پاؤں میں پازیب رہ گئی تھی۔ والدہ صاحبہ

نے کہا کہ اس کو فروخت کرکے کام چلاؤ اگر خدا نے کیا تو شاید اسی امتحان کے بعد ہمارے دن پھریں۔ میری حمیت گوارا نہ کرتی تھی کہ اس معصوم کا زیور لوں۔ لیکن کیا کیا جاتا۔ اور کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا۔ والدہ صاحبہ جب رضیہ کا زیور اُتارنے لگیں تو وہ مچل گئی۔ اُنھوں نے سمجھانا شروع کیا کہ دیکھو بھائی جان پاس ہوجائیں گے تو تم کو اتنا زیور بنادیں گے۔ تمھارے لیے گڑیاں لائیں گے تم کو اچھے اچھے کپڑے سلوا دیں گے۔ میں یہ سب سُنتا رہا۔ لیکن رضیہ کے ایک فقرہ نے ایسا بیتاب کردیا کہ مجھ سے وہاں نہ ٹھہرا گیا۔ اُس کا یہ کہنا کہ "اگر بھائی صاحب پاس نہ ہوئے تو" میرے دل میں تیر کی طرح لگا۔ گو اماں سمجھاتی رہیں کہ نہیں بیٹا ایسی فال منہ سے نہیں نکالا کرتے۔ وہ انشاء اللہ ضرور پاس ہوں گے لیکن رضیہ کے الفاظ ایک تیر تھے کہ اپنا کام کر گئے۔ بہرحال والدہ صاحبہ نے جنی لال مارواڑی کے پاس ساٹھ روپے میں دونوں چیزیں گروی کردیں۔ مجھے ۵۱ روپے دیے کہ جاؤ فیس داخل کرآؤ۔ اور ۹ روپے گھر کے خرچ کے لیے رکھ لیے۔ قصہ مختصر میں نے فیس داخل کردی رات دن محنت کرتا۔ لیکن ہر وقت یہ فکر رہتی کہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ جب خیال آتا تو بُرا ہی خیال آتا۔ بیمار بھی پڑا۔ مگر دو چار روز میں اچھا ہوگیا۔ آخر امتحان کا دن آ ہی گیا اماں نے کہیں نہ کہیں سے کرکے دودھ نان پاؤ رات کو رکھ دیا تھا کہ صبح ہی صبح کھا کر چلا جاؤں گا۔ لیکن رات کو کمبخت بلّی دودھ پی گئی۔ صبح کو جو والدہ صاحبہ اُٹھیں تو سر پکڑ کر رہ گئیں۔

گھر میں اُس روز پیسہ نہ تھا۔ میں بھی اُٹھا۔ اُنھوں نے مجھ سے ذکر کیا۔ میں نے کہا "اماں آپ ناحق فکر کرتی ہیں۔ مجھے آج بھوک نہیں ہے" میں یہ کہہ کر چلا گیا۔ امتحان کے کمرہ میں اپنی جگہ تلاش کی اور بیٹھ گیا۔ لیکن تھوڑی دیر میں بھوک کی وجہ سے چکر آنے لگے۔ اتنے میں پرچہ تقسیم ہونا شروع ہو گیا۔ مجھے بھی ملا۔ میں نے دیکھا لیکن ایک حرف سمجھ میں نہیں آیا۔ ساتھ ہی سر میں چکر آیا۔ اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا۔ میں نے میز پر سر رکھ دیا۔ اس غفلت میں یہ نظر آیا کہ والدہ صاحبہ رضیہ کے زیور اُتار رہی ہیں۔ وہ مچل رہی ہے۔ یہ اس کو سمجھا رہی ہیں۔ کہتی ہیں کہ بیٹا تیرے بھائی پاس ہو جائیں گے۔ تجھ کو یہ لا کر دیں گے، وہ لا کر دیں گے۔ رضیہ نے میری طرف غور سے دیکھا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "اور جو یہ پاس نہیں ہوئے تو" میرا سلسلۂ خیالات یہیں تک پہنچا تھا کہ کسی نے آواز دی کہ "جناب یہ امتحان کا کمرہ ہے سونے کی جگہ نہیں ہے" میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو ایک صاحب مسکراتے ہوئے میری طرف آئے اور کہا کہ "آپ امتحان دینے آئے ہیں یا سونے آئے ہیں" میں کھڑا ہو کر کچھ جواب دینا چاہتا تھا کہ میرے پانوں لڑکھڑانے لگے۔ اُنھوں نے دوڑ کر مجھے سنبھالا۔ اور چپراسی کو آواز دی کہ پانی لاؤ۔ پانی آیا اُنھوں نے مجھے پلایا۔ اُس وقت میرے حواس کچھ درست ہوئے، پرچہ کی طرف دیکھا۔ اس کے ساتھ رضیہ کا فقرہ یاد آیا "اور جو یہ پاس نہ ہوئے تو" اس کا یاد آنا تھا کہ گذشتہ واقعات آنکھوں کے سامنے پھر گئے اور ساتھ ہی کمرہ بالکل تاریک معلوم ہونے لگا۔ نگران کار صاحب یہ کیفیت برابر ٹکٹکی

لگائے دیکھ رہے تھے۔ کچھ سوچ کر میری طرف بڑھے اور کہا۔ "بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہوشیار بھی ہیں اور ذہین بھی۔ اور محنت بھی کی ہے لیکن آپ کی اس حالت کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ کیا آپ بیمار ہیں۔ میں نے کہا نہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ کیا آج آپ بھوکے تو نہیں ہیں" یہ لفظ سنتے تھے کہ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں چپکا ہو گیا۔ اُنھوں نے پھر وہی سوال کیا۔ میں نے کہا "جی ہاں میں آج کھانا کھا کر نہیں آیا" اُنھوں نے کہا "کیوں"، پہلے تو میں خاموش رہا جب اُنھوں نے زیادہ اصرار کیا تو میں نے بہت نیچی آواز میں کہا کہ "گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا" معلوم ہوتا ہے کہ بے اختیار اُن کے مُنہ سے یہ الفاظ نکل گئے "کیا گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا" میں نے کہا "جی ہاں کچھ نہ تھا" میں نے ان کی طرف نظر اُٹھائی تو ان کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ اور چہرہ پر ایک قسم کی سُرخی دوڑ گئی تھی۔ اُنھوں نے اسی وقت چپراسی کو آواز دی کہ نیچے ہوٹل سے جا کر ایک پیالی چائے تھوڑے بسکٹ اور دو تین سنوسہ لے آؤ۔ یہ کہہ کر وہ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے پاس گئے اور اُن سے کچھ کہہ کر میری طرف آئے اور کہا "آپ میرے ساتھ آئیے۔ پرچہ کا خیال نہ کیجیے۔ پہلے کچھ ناشتہ کر لیجیے۔ بعد میں پرچہ بھی ہوتا رہے گا" میں نے انکار کیا وہ زبردستی مجھ کو سپرنٹنڈنٹ صاحب کی میز کے پاس لے گئے۔ وہاں قریب ہی ایک چھوٹی میز پر چائے وغیرہ رکھی ہوئی تھی۔ مجھ سے کہا "آپ اچھی طرح ناشتہ کر لیجیے۔ خالی پیٹ ہے پرچہ کیا خاک سمجھ میں آئیگا" میں نے شکریہ ادا کیا اور چائے پینے لگا۔ اُنھوں نے باتوں ہی باتوں میں تمام حالات پوچھ لیے اور کہنے لگے تمھاری والدہ اور بہن کا کیا حال ہو گا۔ میں نے عرض کیا کہ

سلائی کے آج کچھ پیسے آنے والے ہیں۔ خدا دن گزار دیگا۔ اُنھوں نے کہا "اور اگر آج یہ پیسے نہ آئے تو؟" میں نے کہا کہ "ایسی حالتیں ہم غریبوں پر اکثر گزرتی ہیں۔" بہرحال چائے کی پیالی پی کر میرے اوسان درست ہوئے۔ اُنھوں نے اصرار کرکے دو چار بسکٹ بھی کھلائے۔ اور کہا "اب آپ اپنی جگہ پر بیٹھیے مگر گھبرائیے نہیں پرچہ آسان ہے پرچہ سے غرض رکھیے۔ گذشتہ اور آئندہ واقعات کو دل میں نہ لائیے۔ انشاء اللہ آپ کامیاب ہونگے۔ اور ضرور کامیاب ہونگے۔ پرچہ کے بعد دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیے۔ میں یہ بھی دیکھ لوں گا کہ آپ نے پرچہ کیسا لکھا"۔ میں اپنی جگہ پر آکر بیٹھا۔ پرچہ دیکھا تو واقعی آسان تھا۔ میرے محسن تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد میرے پاس آتے اور کہتے "آپ گھبرائیے نہیں خدا مسبب الاسباب ہے کوئی نہ کوئی صورت آپ کی بہتری نکال دیگا"۔ ایک بجے مجھے لے گئے اور سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ساتھ بیٹھے اور اُنھوں نے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ انھوں نے پوچھا کہ کون صاحب ہیں انھوں نے کہا کہ میرے ایک نہایت عزیز دوست کا لڑکا ہے۔ میں کچھ بولنا چاہتا تھا مگر اُن کے تیور دیکھ کر خاموش ہوگیا۔ بہرحال میں نے دوسرا پرچہ بھی بہت اچھا کردیا۔ اور نگران کار صاحب سے مل کر اپنے گھر کو روانہ ہوا۔ گھر پہنچا تو دیکھا کہ والدہ صاحبہ جانماز پر بیٹھی ہیں۔ رضیہ ان کے برابر بیٹھی ہے۔ وہ دعائیں مانگ رہی ہیں۔ اور رضیہ آمین کہہ رہی ہے۔ پہلے تو اُنھوں نے میری نیک ہدایت اور کامیابی کی دعا مانگی۔ اس کے بعد جو دعا مانگی اُس سے مجھے حیرت ہوگئی۔ فرمانے لگیں "یا الٰہ العالمین جس نے اس مصیبت ہماری خبرگیری کی ہے تو ہر مصیبت سے اس کو بچائیو۔ رضیہ نے کہا آمین۔

یا میرے پروردگار جس نے میرے بچوں کا دکھ درد سمجھا تو اُس کو ہر دکھ درد سے محفوظ رکھیو۔ یا باری تعالیٰ جس نے ہم دکھیاروں کی اس بیکسی میں مدد کی تو ہر حال میں اُس کی مدد کیجیو۔ یا الہٰ العالمین اپنے حبیب پاک کے صدقہ سے اس کو ہر آفت سے بچا۔ اُس کی بیوی اور بچوں کو خوش و خرّم رکھ اور جس طرح اُس نے ہم غریبوں کے ساتھ سلوک کیا اُس کے ساتھ سلوک کر رضیہ برابر آمین کہتی جاتی تھی۔ جب والدہ صاحبہ دعا سے فارغ ہوئیں تو انھوں نے بیٹھ بیٹھی۔ مجھے کھڑا پایا۔ فرمانے لگیں بیٹا پرچے کیسے کر کے آئے۔ میں نے کہا بہت اچھے۔ لیکن اگر ایک صاحب میری وقت پر مدد نہ کرتے تو خدا جانے کیسی گزرتی۔ انھوں نے واقعات پوچھے۔ میں نے بے کم و کاست بیان کر دیے۔ وہ یہ سنتے ہی سجدہ میں گر پڑیں اور بڑی دیر تک رو رو کر چپکے ہی چپکے دعائیں مانگتی رہیں۔ سجدہ سے سر اُٹھا کر اُنھوں نے جانماز کے نیچے سے ایک خط نکالا اور کہنے لگیں ہو نہ ہو یہ بھی اسی فرشتۂ رحمت کا ہے میں نے خط دیکھا۔ لکھا تھا ''جناب ہمشیرہ صاحبہ تسلیم۔ افسوس ہے آج کل ہم لوگ ہماہمی میں کچھ ایسے گرفتار ہو گئے ہیں کہ اپنے غریب اور شریف بھائی بہنوں کی خبر رکھنا اور لینا بے ضرورت سمجھتے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ لوگوں کے حالات معلوم کرنے کے بعد اگر اپنے مقدور کے موافق میں آپ کی امداد نہ کروں تو باری تعالیٰ کو کیا جواب دے سکونگا۔ یہ معلوم کرنے کے بعد کہ رضیہ سلمہا کے زیور کس طرح اور کیوں گروی پڑے ہیں۔ اگر میرے بال بچے زیور پہنیں تو کس منہ سے میں اس غریب نواز حضرت رسالتمآب کے سامنے جاؤنگا جو کچھ اس وقت مجھ سے ہوسکا

وہ گذرانتا ہوں۔ قرض حسنہ سمجھ کر قبول فرمائیے۔ ماشاء اللہ آپ کا بچہ بڑا ہوشیار ہے۔ وہ ادا کر دیگا اور اگر نہ ادا کیا تو میں اُسے معاف کرتا ہوں۔ لیکن آپ خدا کے لیے رضیہ کا دل نہ توڑیے۔ اُس کا زیور منگوا دیجیے۔ کیونکہ جب تک میں نہ سُن لوں کہ اُس کا زیور اُس کو مل گیا مجھے چین نہ آئے گا۔ دعا کیجیے کہ خدائے تعالیٰ مجھ کو اپنے غریب بھائی بہنوں کی مدد کی توفیق عنایت فرمائے۔"

خط کے ساتھ سو روپے کے نوٹ تھے۔ اماں فرمانے لگیں کہ آج تین بجے کے قریب ایک چپراسی آیا تھا۔ یہ دیکر اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ بیگم صاحبہ کا خط ہے۔ ابھی کھول کر اس کو پڑھ لیں۔ مضمون سے تو سمجھ میں آتا تھا کہ میرے نام کا ہے۔ لیکن یہ سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا تھا کہ یہ کون اللہ کا نیک بندہ ہے۔ چلو تمھارے بتانے سے یہ بھی معلوم ہو گیا۔ میں نے کہا "اماں اس طرح روپیہ لینا ٹھیک نہیں۔ بہتر ہو گا کہ کل میں لے جا کر واپس کروں" والدہ صاحبہ نے کہا۔ "نہیں بیٹا۔ ہرگز نہیں۔ اِس طرح روپے واپس کرنے سے اُن کی توہین ہوگی تم اُن کا شکریہ ادا کر دو اور کہہ دو کہ "بھائی یہ تمھارا قرضہ ہے خدا تمھیں اس کی جزائے خیر دے۔ تم نے ہم بے وارثوں کا وقت پر ہاتھ پکڑا۔ ہم اور ہماری اولاد ہمیشہ تمھارے اس احسان سے کبھی سبکدوش نہ ہونگے اور ان سے یہ بھی کہہ دینا کہ بھائی ہم کیا اور ہماری دعا کیا لیکن اس دکھیارے دل سے مرتے دم تک جو دعا نکلے گی وہ تمھارے اور تمھارے بال بچوں ہی کے لیے نکلیگی۔ میں خاموش ہو گیا۔ پھر فرمانے لگیں "بیٹا جا چنی لال کو روپے دیکر رضیہ کا

زیور لے آ۔ اس معصوم کے دل سے خوش ہو کر دعا نکلیگی تو انشاء اللہ ہمارے محسن کا دین و دنیا دونوں میں بھلا ہوگا۔" میں چینی لال سے دونوں چیزیں چھڑا کر لایا۔ والدہ صاحبہ نے رضیہ کو پہنایا۔ وہ ایسی خوش ہوئی کہ کیا بیان کروں کہنے لگی "کیا بھائی جان پاس ہوگئے۔" اماں نے کہا "انشاء اللہ اب پاس ہو جائیں گے۔ بیٹا تم دعا مانگو کہ جس نے تمھیں یہ چیزیں واپس دلوائیں خدا اُس کو دونوں جہان میں جزائے خیر دے۔" غرض اماں کہتی جاتی تھیں اور رضیہ دعائیں مانگتی جاتی تھی۔ اس عرصہ میں مغرب کا وقت ہوگیا۔ نماز پڑھنے کے بعد جب جب میں نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو دن کے تمام واقعات یاد آگئے۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ زبان یاری نہ دیتی تھی۔ اماں نے جو میری یہ حالت دیکھی تو فرمانے لگیں "ہاں بیٹا یہی دعا کا وقت ہے۔ اپنے اور میرے لیے کچھ نہیں اپنے محسن کے لیے دعا کر خدا قبول کرے گا۔" بہر حال نماز سے فارغ ہو کر میں کتاب دیکھنے لگا اور کوئی بارہ بجے سو گیا۔ صبح اُٹھ کر پھر امتحان میں گیا۔ دروازہ ہی پر نگران کار صاحب ملے۔ میں اُن سے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اُنھوں نے مجھے روک دیا۔ اور کہا "میاں صاحبزادے اب میں تمھارا مہاجن ہوں۔ تم کو جب ضرورت ہو مجھ سے بے تکلّف لے جانا۔ مگر یاد رکھنا کہ تم سے یہ رقم مارواڑیوں سے زیادہ سختی سے وصول کروں گا۔"

کھانے کے وقت وہ پھر مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور ساتھ ہی کھانا کھلایا۔ میں نے جو کچھ والدہ صاحبہ نے کہا تھا اُن سے عرض کیا کہنے لگے "میاں اس ماں کی قدر کرو جو مصیبتیں اُٹھا اُٹھا کر تم کو

پال رہی ہے۔ ایسا نہ کرنا کہ آیندہ یہ تمام واقعات بھول جاؤ اور بیوی کے سامنے ماں کو کونے میں بٹھا دو۔" غرض اِسی طرح وہ مجھے نصیحتیں کرتے رہے آج کے پرچے بھی میں نے بہت اچھے کیے۔ اور خدا خدا کرکے امتحان ختم ہوا۔ اب نتیجہ کے انتظار میں ایک ایک دن کاٹنا مشکل ہوگیا۔ آخر ایک دن معلوم ہوا کہ ہفتہ کے دو بجے نتیجہ شایع ہوگا۔ میں بھی بحالت امید و بیم پہنچا۔ دیکھا کہ نوٹس بورڈ پر نتیجہ لگا ہوا ہے۔ اور سامنے سیکڑوں اُمیدوار کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ میں نے بھی گھس گھسا کر نتیجہ دیکھنا شروع کیا۔ لیکن میرے نام کا نمبر نہیں۔ کئی دفعہ دیکھا لیکن نام کا پتہ نہ چلا۔ آخر مایوسی کی عالت میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں کسی نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ پھر کر دیکھوں تو وہی میرا فرشتۂ رحمت ہے۔ ہنس کر کہنے لگے۔ "کہو پاس ہوگئے۔" میں نے کہا "نہیں" اُنھوں نے خود نوٹس بورڈ جاکر دیکھا۔ اور میرے پاس آکر کہنے لگے۔ "ارے میاں تمھارا نام تو سب سے اوّل تھا۔ کسی دل جلے نے اوپر کا حصّہ پھاڑ دیا ہے۔" مجھے یقین نہ آیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر رجسٹرار صاحب کے پاس لے گئے اور اصل رجسٹر میرے سامنے رکھ کر کہا کہ "لو دیکھ لو۔ اور اطمینان کرلو۔ مگر میاں ہم مٹھائی ضرور کھائیں گے۔ یہ نہ ہو کہ پاس ہونے کے بعد ہم کو سوکھا ہی ٹال دو۔" رجسٹرار صاحب نے بھی مبارکباد دی اور میرے پرچوں کی بہت تعریف کرتے رہے۔ خیر میں خوشی خوشی گھر پہنچا۔ والدہ صاحبہ سے جاکر کہا۔ وہ بڑی دیر تک مجھے گلے سے لگاکر روتی رہیں کہ اتنے میں کسی نے آکر کہا کہ ایک زنانہ گاڑی دروازہ پر کھڑی ہے۔ باہر جاکر پوچھا تو معلوم ہوا کہ میرے محسن کی بیوی میری والدہ

کو مبارکباد دینے آئی ہیں۔ خیر ان کو اُنزوا کر میں تو باہر چلا گیا۔ دو ایک گھنٹے کے بعد واپس آیا تو معلوم کہ وہ تشریف لے گئیں ہیں۔ اور میری والدہ سے کہہ گئیں ہیں کہ کل آپ کی اور آپ کے صاحبزادے اور صاحبزادی کی میرے یہاں دعوت ہے گاڑی آئے گی آپ ضرور آئیے۔ دوسرے روز سہ پہر کو گاڑی آئی اور ہم لوگ سوار ہوکر وہاں پہنچے۔ جاکر کیا دیکھتا ہوں کہ بیسیوں گاڑیاں اور موٹریں دروازہ پر کھڑی ہیں۔ اور ایک بڑے ایٹ ہوم کا انتظام ہے۔ شہر کے اکثر عہدہ دار اور بڑے بڑے وکیل جمع ہیں۔ میرے محسن نے میرا تعارف سب سے کرایا۔ ہر ایک سے یہی کہتے تھے کہ میرے ایک مرحوم عزیز دوست کا لڑکا ہے۔ تھوڑی دیر باتیں ہونے کے بعد سب لوگ میز پر گئے، اور ہنسی خوشی وقت گزر گیا۔ کھانا ختم ہونے کے بعد میرے محسن نے کہا۔ "حضرات! ایٹ ہوم میں کسی اسپیچ دینے کا دستور نہیں ہے۔ لیکن خاص حالات کی وجہ سے میں اس طریقہ کے خلاف کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ دعوت کے کارڈ گو میری طرف سے تقسیم ہوئے ہیں۔ لیکن اصل داعی اس دعوت کے (میری طرف اشارہ کرکے) یہ ہیں۔ انھوں نے صرف اس خیال سے کہ آپ صاحبوں سے ان کی پہلی ملاقات نہ تھی۔ یہ ذمہ داری میرے سر رکھی اور میں نے اس خیال سے اُس کو قبول کیا کہ اس طرح آپ لوگوں سے میں ان کا تعارف کرا سکوں گا۔ یہ آپ صاحبوں کو معلوم ہے کہ اس سال کے امتحانِ وکالت میں یہ سب سے اوّل رہے ہیں اور اس بات کا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ نہایت شریف محنتی ایمان دار اور سمجھ دار شخص ہیں۔ اور مجھے یقین کامل ہے کہ ابتدائے وکالت میں

اگر میرے عزیز دوستوں میں سے کسی نے ان کو اپنے ساتھ لے لیا اور آپ صاحبوں نے ان کی بہبودی اور جائز رعایت کا خیال پیش نظر رکھا تو یہ ایک ہوشیار اور کامیاب وکیل ثابت ہوں گے۔ کیا میرے عزیز دوستوں میں سے کوئی میری اس استدعا کو قبول فرمائیں گے؟" اس اسپیچ کے ختم ہوتے ہی شہر کے سب سے ممتاز وکیل یعنی مولوی اصغر خاں صاحب اٹھے اور کہا کہ "میرے عزیز فیاض دوست ...... نے اس نوجوان دوست کے تمام واقعات مجھ سے بیان کر دیے ہیں۔ میں اپنے اس نوجوان دوست کی مدد کرنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتا ہوں اور نہایت خوشی سے اپنے ساتھ وکالت میں شریک کرتا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ میں ان سے یہ ضرور خواہش کروں گا کہ یہ اپنے تمام واقعات بے کم و کاست چھپوا دیں۔ تاکہ ہم لوگوں کو جو روپے کو بے دریغ لٹا رہے ہیں یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے اکثر بھائی اور بہنیں کس مصیبت میں ہیں اور کس طرح غربت بسا اوقات ہمارے جواہر پاروں کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ اور کس طرح ہم لوگ اپنی ہمدردی کے فرض کو بھول کر روپے کو بے غل و غش واہیات اور خرافات میں تباہ کر رہے ہیں۔" اس کے بعد میں نے کھڑے ہو کر بہت مختصر الفاظ میں وکیل صاحب کا شکریہ ادا کیا اور اپنے واقعات کو طبع کرانے کا وعدہ کیا۔ اپنے محسن کے متعلق کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میرا گلا بند ہو گیا اور میں ایک حرف نہ بول سکا۔ یہ دیکھ کر وہ خود اٹھے۔ مجھے گلے سے لگایا۔ اور کہا "میاں صاحبزادے میری تعریف کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر مجھے معلوم ہوا کہ تم نے کبھی اپنے کسی بھائی کی بروقت مدد کی تو میں سمجھ لوں گا کہ احسان

کا بدلہ احسان سے ہوگیا۔ جاؤ اب محنت کرو۔ عدالت کا ادب کرو اپنے ہم پیشہ بھائیوں سے مل جل کر کام کرو۔ اپنے موکلین کی دلجوئی کرو۔ سچ پر قایم رہو۔ خدا تم کو کامیاب کریگا؟"

اس دعوت میں جو وعدہ میں نے کیا تھا اُس کی تعمیل میں میں نے یہ اپنے حالات لکھے ہیں۔ خدا کرے اُن کے پڑھنے سے دوسرے سبق حاصل کریں اور ہم لوگوں میں وہ اسپرٹ پیدا ہو جائے جو میرے محسن میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہے۔

خدا شکر ہے کہ میری وکالت بہت اچھی چل رہی ہے۔ مگر آپ کو باور کرتا ہوں کہ جب امتحان کا خیال آتا ہے تو میرا دل لرز جاتا ہے۔

۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک مشاعرہ

نام نیکِ رفتگاں ضایع مکن   تا بماند نام نیکت برقرار
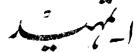
بقول غالب مرحوم انسان "ایک محشرِ خیال" ہے لیکن خیال میں حشر برپا ہونے کے لیے کسی بیرونی تحریک کا ہونا لازمی ہے۔ دماغ خیال کا گنجینہ ہے لیکن اس گنجینے کے کھلنے کے واسطے کسی ظاہری اسباب کی کنجی کی ضرورت ہے، مجھے بچپن سے شعرائے اردو کے حالات پڑھنے اور سننے کا شوق رہا ہے، مگر کبھی کوئی تحریک نہیں ہوئی جو ان کے حالات کو ایک جگہ جمع کرنے کا خیال پیدا کرتی۔ اور یہ خیالات الفاظ کی شکل میں ظاہر ہو کر ایک خوشنما چلتی پھرتی تصویر بن جاتے۔

جب کوئی بات ہونے والی ہوتی ہے تو اسباب خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اتفاق دیکھیے کہ پرانے قدیم کاغذات میں مجھ کو حکیم مومن خاں مومن دہلوی کی ایک قلمی تصویر ملی، تصویر کا ملنا تھا کہ یہ خیال پیدا ہوا کہ تو بھی محمد حسین آزاد مرحوم کے "نیرنگ خیال" کی محفل شعراء کی طرح ایک مشاعرہ قایم کر۔ مگر ان لوگوں کے کلام پر تنقید کرنے کے بجائے صرف

ان کی چلتی پھرتی تصویریں دکھا۔ خیال میں رفتہ رفتہ پختگی ہوئی۔
اور اس پختگیٔ خیال نے ایک مشاعرہ کا خاکہ پیش نظر کر دیا۔ لیکن یہ سمجھ
میں نہیں آتا تھا کہ مختلف زبانوں کے شاعروں کو کس طرح ایک جگہ
جمع کروں۔ اس عقدہ کو امیر اللہ تسلیم مرحوم کے اس شعر نے حل کر دیا ؎

بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے ۔۔۔ جوانی سے زیادہ وقت پیری جوش ہوتا ہے

اس شعر کا دل پر آنا تھا کہ شعرائے دہلی کا آخری دور آنکھوں
کے سامنے پھر گیا اور دل میں یہ بات جم گئی کہ بجائے تمام شعرائے اردو کو
ایک جگہ جمع کرنے کے دہلی کے آخری دور کا نقشہ کھینچ دیا جائے۔ قاعدہ
کی بات ہے کہ مرنے سے پہلے بیمار سنبھالا لیتا ہے۔ اردو شاعری کے
حق میں بہادر شاہ ثانی کا زمانہ بھی دہلی کا سنبھالا تھا۔ بادشاہت
برائے نام تھی اور جو تنخواہ بادشاہ سلامت کو ملتی تھی اس میں قلعہ کا
خرچ بھی مشکل سے چلتا تھا۔ برخلاف اس کے دکن اور اودھ میں
دولت کی گنگا بہہ رہی تھی۔ پھر بھی "دریائے جمنا کی چمکیلی ریت"
دہلی والوں کے لیے نظر فریب رہی اور اس "اجڑے دیار" میں
شعرا ہی نہیں بلکہ ہر فن کے کاملوں کا ایک ایسا مجمع ہو گیا جس کی
نظیر ہندوستان تو ہندوستان دوسرے کسی ملک میں بھی ملنا دشوار ہے۔

زمانہ ایک رنگ پر نہیں رہتا۔ ۱۸۵۷ء سے قبل ہی ان کاملین
فن میں سے بہت سے تو ملک عدم کو سدھارے، جو بچے کھچے رہ گئے
تھے ان کو غدر کے طوفان نے تتر بتر کر دیا۔ جس کو جہاں کچھ سہارا
ملا وہیں کا ہو رہا۔ دہلی برباد ہو کر حیدر آباد اور رامپور آباد ہوئے۔
اکثر شرفا گھروں سے ایسے نکلے کہ پھر ان کو دہلی کی صورت دیکھنی نصیب

نہ ہوئی۔ جو رہ گئے ہیں وہ چلنے چلانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ بہت سے اُٹھ گئے، بہت سے اُٹھتے جاتے ہیں اور ایک زمانہ وہ آنے والا ہے کہ کوئی یہ بتلانے والا بھی نہ رہیگا کہ مومن مرحوم کا مکان کہاں تھا۔ جس طرح سوائے میرے اب شاید کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی قبر کہاں ہے۔

ان چراغ ہائے سحری کو دیکھ کر مجھے خیال آیا (اس خیال کی محرک مومن مرحوم کی تصویر بھی ہوئی) کہ "اردو" کے لیے ان سے ایک ایسا چراغ تو روشن کروں جس کی روشنی میں آنے والی نسلیں زبان اردو کے ان محسنوں کی شکلیں (خواہ وہ دھندلی ہی کیوں نہ سہی) دیکھ سکیں اور ان کا کلام پڑھتے وقت کم سے کم اُن کی صورتوں کا ایک موہوم سا نقشہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ جو لوگ علمی مذاق رکھتے ہیں وہ جانتے اور سمجھتے ہیں کہ کسی کا کلام پڑھتے وقت اگر اس کی شکل و صورت، حرکات و سکنات، آواز کی کیفیت، نشست و برخاست کے طریقے۔ طبیعت کا رنگ اور سب سے زیادہ یہ کہ اُس کے لباس اور وضع قطع کا خیال دل میں رہے تو اُس کا کلام ایک خاص اثر پیدا کر دیتا ہے اور پڑھنے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ ورنہ مصنّف کے حالات سے واقف ہوئے بغیر اس کی کسی کتاب کا پڑھ لینا گراموفون کے ریکارڈ سننے سے زیادہ مؤثر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل مہذب ممالک کے کسی مصنّف کی کوئی ایسی کتاب شائع نہیں ہوتی جس کے شروع میں اس کے حالات درج نہ کیے جائیں اور وہ واقعات نہ دکھائے جائیں

جن کی موجودگی میں وہ تصنیف ضبط تحریر میں آئی۔
یہی خیالات تھے جنھوں نے مجھے ان چند اوراق کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ اس البم میں آپ ایسی بہت سی تصویریں دیکھیں گے جو ان کاملین فن نے اپنے ہاتھ سے خود کھینچی ہیں، بہت سے ایسے مرقع پائیں گے جو دوسرے مصوروں کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں بعض ایسے نقش و نگار ملیں گے جو فوٹو یا قلمی تصاویر دیکھ کر الفاظ میں اُتارے گئے ہیں۔ اکثر و بیشتر ایسی صورتیں ہونگی جو خود میں نے بڑے بوڑھوں سے پوچھ کر بنائی ہیں۔ لیکن ہر صورت میں شہادت تائید کے مقابلے میں شہادت تردیدی کو زیادہ وقعت دی ہے یعنی اگر کسی واقعہ کے متعلق ایک بھی مخالف بات پائی گئی تو اس واقعہ کو قطعاً ترک کر دیا۔
اگر اتنے سارے حلیے ایک جگہ ہی جمع ہو جاتے تو یقیناً یہ مضمون فوج کے چہروں کا رجسٹر بن کر بے لطف ہو جاتا۔ لیکن ادھر تو آزاد مرحوم کے نیرنگ خیال نے دل میں مشاعرہ کا خیال ڈالا۔ اُدھر کریم الدین مغفور کی کتاب طبقات الشعرائے ہند کے طبقۂ چہارم نے رجب ۱۲۶۱ھ کے ایک مشاعرہ کا پتہ دیا۔ اب کیا تھا دونوں کو ملا کر ایک مضمون پیدا کر لیا، رہی رنگ آمیزی اس کی تکمیل میں خود کر دیتا ہوں۔ البتہ اچھے بُرے کی ذمہ داری نہیں لیتا۔
بحیثیت مورخ ۱۲۶۱ھ کے واقعات میں خود اس طرح لکھ سکتا تھا گویا یہ سب میرے چشم دید ہیں۔ اور

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام　　ہفصد و ہفتاد قالب دیدہ ام

پر نظر رکھتے ہوئے اس زمانہ کا بھی "مرزا صاحب" بن سکتا تھا۔ مگر میرے دل نے گوارا نہیں کیا کہ کریم الدین مرحوم کی کامیابی کا سہرا اپنے سر پر باندھوں اور ایسے شخص کو دودھ کی مکھی طرح نکال کر پھینک دوں جس نے اس مشاعرے میں بہت بڑا حصہ لیا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی یہ مجلس محدود تھی اور میں نے اس کو اتنی وسعت دی ہے کہ اُس وقت کے تقریباً سب بڑے بڑے شعراء کو اس میں لا بٹھایا ہے۔ اب اس میں مجھے کامیابی ہوئی یا نہیں اس کا اندازہ قارئین کرام فرماسکتے ہیں۔ اگر ہوئی تو زہے نصیب میری محنت ٹھکانے لگی، اگر نہیں ہوئی تو کم سے کم یہی سمجھ کر میری داد دی جائے کہ۔ "مرزا صاحب نے بات تو اچھی پیدا کی تھی، مگر نباہ نہ سکے، جو اُن سے نہیں ہوا وہ اب ہم کر دکھاتے ہیں" ممکن ہے کہ اس طرح کوئی قلم کا دھنی ان "خفتگان خاک" کا ایک ایسا مرقع تیار کر دے جو بزم ادب اردو میں سجانے کے قابل ہو۔

لیجیے۔ میں۔ اب، مولوی کریم صاحب کی جوتی میں حاضر خدمت ہوتا ہوں، لیکن یہ ضرور عرض کیے دیتا ہوں کہ جب میں اپنی تمام محنت "کریم الدین صاحب" کے نذر کر رہا ہوں تو جو کچھ بُرا بھلا آپ کو اس مضمون کے متعلق کہنا ہے وہ مجھے نہ کہیے۔ مولوی صاحب کو کہیے اور خوب دل بھر کر کہیے۔ میں خوش اور میرا خدا خوش۔ والسّلام

مرزا فرحت اللہ بیگ

۲۔ تدبیر

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا　　نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

میرا نام کریم الدین ہے، میں پانی پت کا رہنے والا ہوں۔ یہ قصبہ دہلی سے ۴۰ کوس پر بجانب شمال مغرب واقع ہے اور اپنی لڑائیوں کی وجہ سے تاریخ میں مشہور ہے۔ ہم اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ مولویوں کا خاندان تھا، لیکن زمانہ کی گردش نے ایسا پیسا کہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے۔ جائداد ضبط ہو گئی، میرے دادا صاحب قبلہ ایک مسجد میں جا بیٹھے اور اللہ اللہ کر کے گزار دی۔ جب ضبط شدہ جائدادوں کے متعلق دریافت شروع ہوئی تو، توکل نے ان کا دامن پکڑ لیا، اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیشہ کے لیے روٹیوں کا سہارا کھو بیٹھے۔ میرے والد سراج الدین مرحوم بمصداق عصمت بی بی از بے چادری متوکل بنے رہے اور مسجد میں ایسے بیٹھے کہ مر کر ہی اُٹھے۔ میں ۱۲۳۷ھ ہجری میں عین عید الفطر کے دن پیدا ہوا۔ میری تعلیم انھی دونوں بزرگوں کے ہاتھوں ہوئی۔ لیکن بے چین طبیعت اور خاندانی جھگڑوں نے آخر پانی پت چھڑا دیا۔ اس زمانہ میں دہلی میں علم کا بڑا چرچا تھا۔ ہر فن کے کاملوں سے دہلی بھری پڑی تھی۔ ہر سمت علم کے چشمے جاری تھے۔ "ملا کی دوڑ مسجد" میں بھی پانی پت چھوڑ دہلی آ گیا۔ شہر میں چھاپے خانے نئے نئے چلے تھے۔ کاپی نویسی سے گزارا

کرتا، محنت مزدوری کے بعد بھی ذوق علم ہر حلقہ درس میں مجھے لے جاتا۔ اسی زمانہ میں دہلی کالج کی تنظیم جدید ہوئی تھی۔ طالب علموں کی تلاش تھی میں بھی ۱۸ سال کی عمر میں وہاں شامل ہوگیا۔ سولہ روپیے وظیفہ بھی مقرر ہوا۔ اور اس طرح میں نے علم کی پیاس بڑی حد تک بجھائی۔ لیکن یہ وہ زمانہ نہیں تھا کہ علم کو علم کے لیے حاصل کیا جاتا اب اس کے ساتھ گزارہ کی بڑی شق لگ گئی تھی۔ اس لیے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک مطبع کھولا۔ قاضی کے حوض پر مبارک النساء بیگم کی حویلی کرایہ پر لی۔ عربی کی مشہور کتابوں کے ترجمے چھاپے۔ لیکن مطبع جیسا چلنا چاہیے تھا نہ چلا۔ یہ اردو شاعری کے شباب کا زمانہ تھا۔ بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ خیال آیا کہ ایک مشاعرہ کر کے شعرا کے حالات اور ان کا کلام طبع کروں۔ ممکن ہے کہ اس طرح مطبع چل جائے۔ مجھے شاعری سے نہ کبھی لگاؤ تھا اور نہ اب ہے، بلکہ شعر کہنا میں برا جانتا ہوں۔ کیونکہ اہل علم کا یہ پیشہ نہیں ہے۔ وہ لوگ جو معیشت سے فارغ البال ہیں اپنے دل بہلانے اور حسرت نکالنے کے لیے شاعری کرتے ہیں۔

میں خود عالم ہوں، میرے باپ دادا عالم تھے، بھلا میں تو اس قسم کے فضولیات کی طرف توجہ بھی نہ کرتا، مگر کیا کروں، ضرورت سب خیالات پر حاوی ہوگئی اور مجھے قیام مشاعرہ پر مجبور کیا۔ لیکن بڑی مصیبت یہ ہے کہ ایک تو اس شہر میں غریب اور خاص کر پردیسی۔ غریب کو منہ نہیں لگاتے۔ دوسرے یہ کہ

میری جان پہچان تھی تو مولویوں سے، وہ بھلا اس معاملہ میں میرا کیا ساتھ دے سکتے تھے۔ سوچتے سوچتے نواب زین العابدین خان عارف، پر نظر پڑی۔ اُن سے دو چار دفعہ ملنا ہوا تھا۔ بڑے خوش اخلاق آدمی ہیں۔ لال کنوئیں کے پاس ایک حویلی ہے اس کو مدرسہ بھی کہتے ہیں، وہاں رہتے ہیں۔ کوئی ۳۰ سال کی عمر ہے۔ گوری رنگت، اونچا قد اور نہایت جامہ زیب آدمی ہیں۔ البتہ ڈاڑھی بھر کر نہیں نکلی ہے۔ ٹھڈی ہی پر کچھ گنتی کے بال ہیں۔ غالب کے بھانجے بھی ہیں اور شاگرد بھی۔ کچھ عرصہ تک شاہ نصیر سے بھی اصلاح لی ہے بہرحال ان کی محبت ان کی شرافت اور سب سے زیادہ اُن کے رسوخ نے مجھے اُن کی خدمت میں حاضر ہونے اور اس بارے میں ان کی امداد حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ ایک روز صبح ہی صبح گھر سے نکل اُن کے مکان پر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ وہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب وزیر اعظم کے مکان پر تشریف لے گئے ہیں۔ حکیم صاحب کا مکان سرکی والوں ہی میں تھا۔ واپسی میں دروازے پر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ نواب زین العابدین خاں اندر ہیں۔ چوبدار کے ذریعہ سے اطلاع کرائی۔ اُنھوں نے اندر بلا لیا۔ بڑا عالیشان مکان ہے صحن میں نہر ہے، سامنے چبوترہ ہے اور چبوترہ پر بڑے بڑے دالان در دالان ہیں۔ مکان خوب آراستہ پیراستہ ہے، ہر چیز سے امارت ٹپکتی ہے۔ سامنے گاؤ تکیہ سے لگے نواب صاحب بیٹھے تھے، میں نے تو ان کو پہچانا بھی نہیں، سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے۔ اور

چہرے پر جھرّیاں پڑ گئی تھیں۔ میں نے سلام کرکے کیفیت پوچھی، کہنے لگے "مولوی صاحب کیا کہوں کچھ دل بیٹھا جاتا ہے۔ بظاہر کچھ مرض بھی معلوم نہیں ہوتا علاج کر رہا ہوں مگر بے نتیجہ۔ بھئی اب ہمارے چل چلاؤ کا زمانہ ہے کچھ دنوں دنیا کی ہوا کھا رہے ہیں۔ مگر یہ تو کہیے آج آپ کدھر نکل آئے۔" میں نے واقعات کا اظہار کرکے ضرورت بیان کی۔ تھوڑی دیر تک سوچتے رہے پھر ایک آہ بھر کر کہا "میاں کریم الدین گو بات تو اچھی سوجھی ہے۔ مگر بھئی اس کا نباہنا مشکل ہے۔ تمھیں خبر نہیں کہ دہلی کے پہلے مشاعروں نے کیا کچھ دلوں میں فرق ڈال دیے ہیں۔ دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لوں جس میں یہاں کے سب کاملین فن جمع ہو جائیں۔ مگر مجھے یہ بیل منڈھے چڑھتی معلوم نہیں ہوتی۔ اچھا تم بھی کوشش کرو میں بھی کرتا ہوں۔ ممکن ہے کوئی صورت نکل آئے۔ ہاں ٹھیرو، حکیم صاحب کو آنے دو، ایک تجویز ذہن میں آئی ہے اگر چل گئی تو میری بھی آخری تمنّا پوری ہو جائیگی اور تمھارا بھی کام نکل جائیگا۔" ہم یہ باتیں کر رہی رہے تھے کہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب نکل آئے۔ گورے چٹے آدمی ہیں، سفید بھری ہوئی ڈاڑھی، گول چہرہ اس میں کچھ کچھ چیچک کے داغ، آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی، سر سے پاؤں تک سفید لباس پہنے ہوئے تھے، فن طب میں کامل اور تاریخ کے عالم ہیں۔ میں آداب بجا لایا۔ میری طرف مسکرا کر دیکھا اور نواب صاحب سے کہا "آپ کی تعریف کیجیے۔" اُنھوں نے کہا "یہ میرے قدیم ملنے والوں میں سے ہیں۔ خود شاعر نہیں مگر

شعر فہم ہیں۔ آج کل خیال پیدا ہوا ہے کہ شعرائے دہلی کا ایک تذکرہ لکھیں اور اس میں اُن کے حلیے اور ان کے کلام کے نمونے دکھائیں۔ مجھ سے مشورہ کرنے آئے تھے۔ آپ جانتے ہیں مجھے ان چیزوں سے عشق ہے۔ اب اپنا آخری وقت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ پُرانے رنگ کا ایک مشاعرہ اور دیکھ لوں۔ اگر آپ مدد فرمائیں تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے" حکیم صاحب کہنے لگے۔ "میاں عارف خدا کے لیے تم ایسی مایوسی کی باتیں نہ کیا کرو، ابھی جوان ہو، انشاء اللہ خود طبیعت مرض پر غالب آجائیگی، اور تمھیں مرض ہی کیا ہے۔ وہم ہی وہم ہے۔ مگر ہاں یہ تو بتاؤ تم مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتے ہو" نواب صاحب نے کہا "حکیم جی اور کچھ نہیں، اتنا کردو کہ میاں کریم الدین کو بارگاہِ جہاں پناہی تک پہنچا دو۔ میں خود جاتا مگر ہمت نہیں ہوتی، میں اُن کو سب کچھ سمجھا دوں گا۔ اگر حضرت ظل اللہ اپنا کلام بھیجنے پر راضی ہو گئے تو مشاعرہ کا جم جانا کوئی مشکل کام نہیں۔ اور اگر بدقسمتی سے انکار ہو گیا تو پھر مشاعرے کا خیال کرنا ہی فضول ہے۔ اب رہا مشاعرہ کا انتظام، وہ میں خود کرلوں گا کیونکہ یہ بیچارے ان چیزوں کو کیا سمجھیں" حکیم صاحب پہلے تو کچھ سوچتے رہے پھر کہا۔ "عارف! تمھارے لیے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں، اس لیے اور بھی کروں گا کہ اس سے تمھاری طبیعت بہل جائیگی اور کچھ دنوں اس مشغلے میں لگ کر ممکن ہے کہ تمھارے دل سے مرض کا وہم جاتا رہے۔ بادشاہ

سلامت سے تو میں کہتا نہیں، ہاں آپ کے دوست کو صاحب عالم مرزا فتح الملک بہادر[1] سے ملا دیتا ہوں۔ ان کو آج کل مشاعرہ کی لو لگی ہوئی ہے، حضور سے بھی کئی مرتبہ عرض کر چکے ہیں۔ مگر وہ ٹال گئے۔ اگر ان صاحب نے ذرا بھی زور دیا تو مجھے یقین ہے کہ صاحب عالم کہہ سُن کر ضرور اجازت حاصل کرلیں گے۔ اچھا تو مولوی صاحب کل آپ ایک بجے قلعہ معلّٰی میں آجائیے۔ میں چوبدار سے کہے جاتا ہوں یہ اندر پہنچا دیگا آگے آپ جانیں اور آپ کی قسمت۔" یہ کہہ کر حکیم صاحب نے خدا بخش کو آواز دی۔ وہ آیا تو اُس سے کہا کہ "کل یہ صاحب حویلی[2] میں ایک بجے آئیں گے ان کو میری بیٹھک میں پہنچا دینا"۔ یہ کہہ کر وہ نواب صاحب کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور میں آداب کرکے واپس چلا آیا۔

دوسرے روز ایک بجے کے قریب مولویانہ ٹھاٹھ سے جبّہ پہن، شملہ باندھ قلعہ معلّٰی پہنچا۔ لاہوری دروازہ کے باہر خدا بخش

---

[1] ان کا نام مرزا فخر الدین، خطاب مرزا فتح الملک شاہ بہادر عرف مرزا فخرو اور تخلص "رمز" تھا۔ بہادر شاہ ثانی کے منجھلے بیٹے تھے۔ مرزا محمد دارا بخت عرف مرزا شبو ولیعہد سلطنت کے انتقال کے بعد ۱۸۴۹ء میں ولیعہد ہوئے۔ مگر غدر سے پہلے ہی ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کو ۴۰ سال کی عمر میں انتقال کیا ان کے انتقال کے بعد مرزا جواں بخت کی ولیعہدی کے جھگڑے پڑے۔

[2] قلعہ دہلی کو لال حویلی یا صرف حویلی بھی کہا جاتا ہے۔ حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان کا شعر ہے کہ

مری تنخواہ لوٹی ان لٹیروں نے حویلی میں　　دوہائی ہے بہادر شاہ غازی کی دوہائی ہے

کھڑے ہوئے تھے وہ مجھ کو حکیم صاحب کی بیٹھک میں لے گئے۔ یہ بیٹھک جس کو پہلے زمانہ میں "نشست" کہا جاتا تھا دیوان عام سے ملی ہوئی تھی۔ حکیم صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے "اجی! مولوی صاحب میں نے آپ کا کام کر دیا ہے۔ صاحب عالم مرزا فتح الملک بہادر سے صبح ہی کو ملنا ہو گیا۔ وہ اس تجویز سے بڑے خوش ہوئے، فرماتے تھے "جہاں پناہ سے میں اجازت لیے لیتا ہوں۔ مگر مشاعرہ کا انتظام ایسا ہونا چاہیے کہ ہم لوگ بھی آسکیں۔ خیر بیٹھیے۔ شاید ابھی آپ کی یاد ہوئے" میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ بیٹھا ہی تھا کہ چوبدار نے آکر کہا۔ "وہ کریم الدین کون صاحب ہیں۔ ان کو حضور والا یاد فرماتے ہیں"۔ یہ سُننا تھا کہ میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میں سمجھا تھا کہ حکیم صاحب ہی کے پاس جا کر معاملہ طے ہو جائیگا۔ یہ کیا خبر تھی کہ بارگاہِ جہاں پناہی میں یاد ہوگی۔ اور یاد بھی ایسے وقت کہ میرا سانس بھی پیٹ میں پوری طرح نہ سمایا ہوگا۔ "حکم حاکم مرگ مفاجات" اٹھا اور چوبدار کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ تمام راستے آیۃ الکرسی پڑھتا رہا۔ آنکھ اُٹھا کر یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ بندۂ خدا کدھر لیے جا رہا ہے۔ اندر سے قلعہ دیکھنے کا مدت سے شوق تھا۔ اب جو موقع ملا تو کن آنکھوں سے بھی دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ چلتے چلتے آندھ آگئی آخر خدا خدا کر کے چوبدار نے دیوان خاص کی سیڑھیوں کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیا۔ اور آپ اندر اطلاع دینے چلا گیا۔ حضرت جہاں پناہ اس وقت حمام میں رونق افروز تھے۔ جن صاحبوں نے دہلی کا قلعہ نہر دیکھا

ہے وہ شاید نہ سمجھ سکیں کہ گرمیوں میں حمام میں بیٹھنے کے کیا معنی۔
اصل یہ ہے کہ یہ حمام کیا ہے ایک عالی شان عمارت ہے اس کے
دو درجے ہیں ایک گرم اور دوسرا سرد، عمارت کا جو حصہ موتی مسجد
کی جانب ہے وہ گرم ہے اور جو جمنا کے رُخ پر ہے وہ سرد ہے۔
ریتی کے رُخ خس کے پردے ڈال کر خسخانہ بنا لیا جاتا ہے۔ اندر
نہر بہتی ہے۔ بیچ میں کئی بڑے بڑے حوض ہیں۔ ان میں فوارے
چلتے ہیں۔ حمام کیا ہے ایک بہشت کا ٹکڑا ہے۔ چوبدار جو گیا تو
آنے کا نام نہیں لیتا۔ دھوپ میں کھڑے کھڑے فشار ہو گیا پسینہ
میں تر بتر گردن نیچی کیے کھڑا ہوں اور ناک سے پسینے کی بوندیں
ٹپ ٹپ گر رہی ہیں۔ ارادہ ہوا کہ واپس چلا جاؤں، مگر اول تو
طلبی کے بعد بھاگ جانا ہی نازیبا، دوسرے راستہ کس کو معلوم۔
خدا خدا کر کے یہ مشکل آسان ہوئی اور چوبدار نے آ کر کہا کہ "چلیے"
اس ایک لفظ نے خود بخود پاؤں میں لغزش اور دل میں کپکپی
پیدا کر دی۔ خیر کسی نہ کسی طرح اُلٹے سیدھے پاؤں ڈالتا حمام
مبارک میں داخل ہو گیا۔ چوبدار نے آواز دی "ادب سے۔
نگاہ رو برو، حضرت جہاں پناہ سلامت، آداب بجا لاؤ" میں
نواب زین العابدین خاں صاحب سے یہ سبق پورا اور اچھی طرح
پڑھ کر آیا تھا۔ دُھرا ہو کر سات تسلیمات بجا لایا۔ اور نذر گزرانی۔
نذر دیتے وقت ذرا آنکھ اونچی ہوئی تو وہاں کا رنگ دیکھا۔ حضرت
پیر و مرشد ایک چاندی کی پلنگڑی پر لیٹے تھے۔ پائینتی مرزا فخرو بیٹھے
پاؤں دبا رہے تھے۔ دہلی میں وہ کون ہے جس نے حضرت ظل اللہ کو

نہیں دیکھا۔ میانہ قد، بہت نحیف جسم، کسی قدر لمبا چہرہ، بڑی بڑی روشن آنکھیں، آنکھوں کے نیچے کی ہڈیاں بہت اُبھری ہوئی، لمبی گردن، چوکا ذرا اُونچا، پتلی ستواں ناک، بڑا دہانہ، گہری سانولی رنگت، سر منڈا ہوا، چھدری ڈاڑھی، کلّوں پہ بہت کم ٹھوڑی پر ذرا زیادہ لمبیں کتری ہوئی، ۷۰ برس سے اونچی عمر تھی، بال سفید جھک ہوگئے تھے، لیکن پھر بھی ڈاڑھی میں اکا دوکا سیاہ بال تھا۔ چہرہ پر جھرّیاں تھیں۔ لیکن باوجود اس پیرانہ سالی اور نقاہت کے آواز میں وہی کرارا پن تھا۔ سبز کمخواب کا ایک برکا پیجامہ اور سفید ڈھاکہ کی ململ کا کرتا زیب بدن تھا۔ سامنے ایک چوکی پر جامہ وار کی خفتان اور کارچوبی چوگوشیہ ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔ اب رہے مرزا فخرو تو وہ عین مین باپ کی تصویر تھے، ۳۲، ۳۳ برس کی عمر تھی۔ فرق تھا تو بس یہی کہ وہ بڈھے تھے یہ جوان۔ ان کا رنگ بڑھاپے کی وجہ سے ذرا کلونس لے آیا تھا۔ ان کا کھلا گیہوا ں رنگ تھا۔ ان کی ڈاڑھی سفید تھی۔ ان کی سیاہ، ورنہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ ایک بادشاہ لیٹے ہیں اور ایک بیٹھے ہیں۔ دونوں نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی اور بادشاہ سلامت نے فرمایا "اماں[1]"

---

(۱) قلعہ دہلی کے دور آخر میں شاہان دہلی بعض وقت مرد و عورت دونوں کو "اماں" سے خطاب کیا کرتے تھے اس پرانے طرز کلام کی جھلک حیدرآباد کی روزمرہ میں بھی کسی قدر نظر آتی ہے۔ مجھے بڑا تعجب ہے کہ ایک مورخ نے اس طریقہ مخاطبت کی بنا پر قلعۂ معلی کی تہذیب پر حملہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ بادشاہ کے اخلاق کی (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۷)

تمھارا ہی نام کریم الدین ہے! تم کہیں باہر کے معلوم ہوتے ہو۔"
میں نے کہا کہ "خانہ زاد پانی پت کا رہنے والا ہے۔ بچپن ہی سے
حضرت ظل اللہ کے سایۂ عاطفت میں آ رہا ہے۔" فرمایا "اماں! ابھی
تمھارا ہی تذکرہ مرزا فخرو کر رہے تھے۔ میرا خود جی چاہتا ہے کہ
پہلے کی طرح دیوان عام میں مشاعرہ کروں، مگر کیا کروں زمانہ کی
ہوا ایسی بگڑ گئی ہے کہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ
"بود ہم پیشہ باہم پیشہ دشمن" لیکن خدا محفوظ رکھے ایسی دشمنی بھی
کس کام کی کہ دو گھڑی مل جل کر نہ بیٹھنے دے۔ دیوان عام میں
مشاعرہ ہوتا تھا، وہ کچھ دنوں ٹھیک چلا، پھر میں نے دیکھا کہ
بے لطفی بڑھ رہی ہے۔ اس لیے بند کر دیا۔ منشی فیض پارسا نے
اجمیری دروازے کے باہر غازی الدین خاں کے مدرسہ میں مشاعرہ
شروع کیا، وہ تیلیوں کی طرح بکھر گیا۔ وہ تو کہو غنیمت ہوا کہ
ردیف میں "تیلیاں" ہی تھیں، کہیں خدا نخواستہ اگر ردیف
"لکڑیاں" ہوتی تو خدا معلوم کتنوں کے سر پھوٹ جاتے۔ تم
مشاعرہ تو کر رہے ہو مگر ان ہاتھیوں کی ٹکر کیسے سنبھالو گے۔ اُستاد
ذوق تو بچارے بے زبان آدمی ہیں، مگر خدا بچائے حافظ ویران
سے وہ ضرور لڑ مریں گے اور تم جانتے ہو "اندھے کی داد نہ فریاد

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) یعنی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو بھی "اماں"
کہتا تھا۔" معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحب انگریزی نہیں جانتے تھے ورنہ ان کو پڑھ کر تعجب ہوتا کہ
جس قوم کو وہ تہذیب کا پتلا اور اخلاق کا نمونہ ظاہر کرتے ہیں ان کے ہاں بھی خاوند اپنی
بیوی کو "اماں" ہی کہتا ہے اور بیوی خاوند کو کبھی "ابا"، کبھی "دادا" پکارتی ہے۔

اندھا مار بیٹھے گا " کی صورت ہے۔ کسی نے اگر مشاعرے میں اُستاد پر ذرا بھی چوٹ کر دی تو ان نابینا صاحب کا سنبھالنا مشکل ہو جائیگا۔ میاں تم سے یہ کام سنبھلتا نظر نہیں آتا۔" میں نے عرض کی کہ " قبلۂ عالم! میری کیا ہمت ہے جو میں اتنے بڑے کام میں ہاتھ ڈال سکوں، مشاعرے کا سارا انتظام نواب زین العابدین خاں عارف نے اپنے ذمہ لیا ہے۔" فرمایا۔ " تو پھر مجھے اطمینان ہے۔ یہ لڑکا بڑا ہوشیار اور ذہین ہے۔ مرزا نوشہ اور مومن خاں کو وہ سنبھال لیگا۔ رہے اُستاد ذوق اُن سے میں کہہ دوں گا۔ خدا نے چاہا تو اس طرح مشاعرہ چل جائیگا۔ مگر میں یہ کہے دیتا ہوں کہ مشاعرے سے پہلے ان لوگوں سے مل لو کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت پر انکار کر بیٹھیں۔ میں اور مرزا شبو تو آ نہیں سکتے ہیں ہاں مرزا فخرو کو اپنی جگہ بھیج دونگا اور انشاءاللہ اپنی غزل بھی بھیجونگا۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ تم نے " طرح " کیا رکھی ہے۔ " طرح " ہی تو بڑے جھگڑے کی چیز ہے، یہ ذرا سوچ سمجھ کر دینا۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بازو سے آواز آئی " اے ہے یہ اتنا بچّہ کو کیا بے طرح سُلا گئی ہے۔" یہ سنتے ہی بادشاہ سلامت نے فرمایا۔ " لو بھائی یہ خود بخود فال گوش مل گئی۔ تم اس مشاعرہ میں کوئی " طرح " ہی نہ دو۔ جس شخص کا جس بحر جس ردیف قافیہ میں غزل پڑھنے کو دل چاہے پڑھے۔ " نہ لینا ایک نہ دینا دو۔" میں نے عرض کی پیرو مرشد تاریخ۔ فرمایا ۱۴ ربیع مقرر کردو۔ دن بھی اچھا ہے۔ چاندنی رات بھی ہوگی۔ آج پانچ تاریخ ہے نو دن باقی ہیں۔ اتنے دنوں

میں بہت کچھ انتظام ہو سکتا ہے۔ انگریزی کی ۲۰ جولائی پڑے گی موسم بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اچھا اب خدا حافظ" میں نے عمر و دولت و اقبال کو دعا دی۔ اور خوش خوش الٹے قدموں واپس ہوا مرزا فخرو بیچ میں کچھ نہیں بولے۔ مگر میں سمجھتا تھا کہ یہ سب کیا دھرا انہیں کا ہے ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ خلوت شاہی۔ سچ ہے "بگڑی بنجاتی ہے جب فضل خدا ہوتا ہے" یہاں میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میرے لیے حضوری اتنی مشکل نہ تھی جتنا رخصت ہو کر یہ الٹے پاؤں چلنا ہوا۔ زمین پاؤں کو نہیں لگ تھی اس لیے دو چار قدم ہی چلا ہوں گا کہ پیچھے ایک دیوار سے ٹکرایا۔ اس ٹکر سے ذرا سنبھلا تھا کہ نہر میں پاؤں جا پڑا۔ خیر بہزار مشکل اس جادۂ ادب کو طے کر کے باہر نکل ہی آیا ادھر میں نکلا ادھر چوبدار ساتھ ہوا۔ اس کو انعام دے دلا کر ٹالا۔ حکیم صاحب کے پاس آیا وہ میرے انتظار ہی میں بیٹھے تھے۔ ان سے تمام واقعہ بیان کیا۔ فرمانے لگے۔ "مولوی صاحب بات یہ ہے کہ مرزا فخرو بہت دنوں سے مشاعرے کے لیے بیچین ہو رہے تھے ان ہی کی یہ کارگزاری ہے۔ ورنہ بھلا یہ معاملہ اس طرح تھوڑی طے ہوتا۔ مگر چلو تمہارا کام بن گیا میاں عارف سے بھی جا کر کہہ دو۔ وہ میرے ہاں بیٹھے انتظار کر رہے ہوں گے۔"

حکیم صاحب کے مکان پر پہنچا تو دیکھا کہ واقعی نواب صاحب میرے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ان سے حالات بیان کیے۔ کہنے لگے۔ چلو یہ مشکل تو آسان ہوئی اب تم یہ کرو کہ کل کم سے کم استاد ذوق

مرزا نوشتہ اور حکیم مومن خاں کے مکان کا گشت لگا ڈالو، مگر دیکھنا ذرا پھونک پھونک کر قدم رکھنا۔ یہ تینوں بڑے دماغ دار آدمی ہیں، اگر ذرا بھی تم سے بات چیت میں لغزش ہوئی۔ تو یاد رکھو بنا بنا یا کھیل بگڑ جائے گا۔ جب دیکھو کہ ان میں کوئی ہاتھوں سے نکلا ہی جاتا ہے تو میرا نام لے دینا۔ کیا عجب ہے کہ میرا نام سُن کر راضی ہوجائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ مبارک النسا بیگم کی حویلی جس میں تمھارا مطبع ہے دو روز میں خالی کر کے بالکل میرے حوالے کردو۔ مجھے وہاں نشست کا انتظام کرنا ہوگا۔" میں نے عرض کی "اور میں کہاں جاؤں" فرمانے لگے "میرے مکان میں آٹھ نو روز کے لیے آجاؤ۔ تم کو تکلیف تو ہوگی مگر کیا کیا جائے۔ جب قلعہ کے لوگوں کو بلا رہے ہیں تو انھیں کے رُتبے کے موافق مکان کو بھی درست کرنا ہوگا۔ دیکھیے خرچ کیا پڑتا ہے۔" میں نے کہا "مشاعرہ میں خرچ ہی ایسا کونسا ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ سو ڈیڑھ سو روپے اُٹھ جائیں گے۔" یہ سُن کر نواب صاحب مسکرائے اور کہا "میاں کریم الدین تم کیا جانو کہ ایسے مشاعروں میں کیا خرچ ہوجاتا ہے۔ ہزار دو ہزار میں اگر پوتھ پورا ہوگیا تو سمجھو کہ سستے چھوٹے۔" یہ سُن کر تو میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ میں نے کہا نواب صاحب اگر یہ صورت ہے تو میرا ایسے مشاعرے کو دُور ہی سے سلام ہے، مطبع تو مطبع اگر اپنے آپ کو بھی بیچ ڈالوں تو اتنی رقم نہ اُٹھے۔" فرمانے لگے۔ "بھئی تم اس خرچ کے جھگڑے میں نہ پڑو۔ خدا یہ مشکل بھی آسان کردے گا۔ جب میں نے اس کام میں ہاتھ ڈالا ہے تو میں جانوں

اور میرا کام جانے۔ تم بیٹھے تماشہ دیکھو۔ مگر ہاں مکان کل تک خالی کر دینا۔ تو ہی دن تو رہ گئے ہیں، رات کم اور سوانگ بہت ہے۔ اب جاؤ خدا حافظ۔ تم تھک بھی گئے ہو۔ ذرا آرام لے لو اور کل صبح ہی سے اِدھر مکان خالی کرنے کی فکر کرو۔ اُدھر ان تینوں اُستادوں کے مکان کا چکّر لگاؤ۔ مکان خالی ہو جائے تو فوراً ہی مجھے اطلاع دینا۔ اور میرے ہاں چلے آنا۔ اس میں شرم کی کونسی بات ہے۔ آخر میری ہی وجہ سے تو تم اپنا مکان چھوڑ رہے ہو۔“ وہاں سے نکل کر میں اپنے گھر آیا۔ مطبع کو بند کرتے کرتے اور سامان کو سمیٹتے سمیٹتے شام ہوگئی صبح اُٹھ کر اپنے پڑھنے لکھنے کا سامان تو نواب زین العابدین خاں کے مکان پر روانہ کیا اور خود کابلی دروازہ کی طرف چلا کہ پہلے اُستاد ذوق ہی سے بسم اللہ کروں۔

کابلی دروازہ کے پاس ہی ان کا مکان ہے۔ بہت چھوٹا ہے۔ چھوٹی سی ڈیوڑھی ہے۔ اس میں ایک طرف جائے ضرور ہے۔ اندر صحن اتنا چھوٹا کہ دو پلنگ بچھنے کے بعد راستہ چلنے کے لیے مشکل سے جگہ رہتی ہے۔ سامنے چھوٹا سا دالان ہے اور اس کے اُوپر ایک کمرہ صحن میں سے زنانہ مکان میں راستہ جاتا ہے۔ جب میں پہنچا تو اُستاد صحن میں بان کی کھرّی چارپائی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ دوسری چارپائی پر ان کے چہیتے شاگرد حافظ غلام رسول ویران بیٹھے تھے۔ یہ اندھے ہیں اور انھی سے ہوشیار رہنے کے لیے جہاں پناہ نے ارشاد فرمایا تھا۔ اُستاد ذوق قد و قامت میں متوسط اندام ہیں رنگ اچھا سانولا ہے، چہرے پر

چیچک کے بہت داغ ہیں۔ آنکھیں بڑی بڑی اور روشن اور نگاہیں تیز ہیں۔ چہرے کا نقشہ کھڑا کھڑا ہے۔ اس وقت سفید تنگ پیجامہ، سفید کرتہ اور سفید ہی انگرکھا پہنے ہوئے تھے۔ سر پر ململ کی ٹوپی، گول چندوے کی تھی۔ میرا صحن میں قدم رکھنا تھا کہ پاؤں کی آہٹ سنتے ہی حافظ ویران نے چونک کر کہا "کون ہے؟" میں نے کہا "کریم الدین، اُستاد ذوق کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔" اُستاد نے اپنا نام سن کر کہا "آئیے آئیے اندر تشریف لائیے۔" میں نے آداب کیا اُنھوں نے فرمایا "بیٹھو بھئی بیٹھو۔" میں حافظ ویران کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کہا "فرمائیے کیسے تشریف لانا ہوا۔" میں نے عرض کیا کہ میرا ارادہ قاضی کے حوض پہ ایک مشاعرہ شروع کرنے کا ہے ۱۴ رجب تاریخ مقرر ہوئی ہے۔ اگر حضور بھی از راہِ ذرہ نوازی قدم رنجہ فرمائیں تو بعید از کرم نہ ہوگا۔" میرا اتنا کہنا تھا کہ حافظ ویران تو چراغ پا ہو گئے۔ کہنے لگے "جائیے جائیے، کہاں کا مشاعرہ نکالا ہے۔ اُستاد کو فرصت نہیں ہے۔ اُن مرزا لے پالک[1] کے پاس کیوں نہیں جاتے جو

---

[1] ان دنوں دہلی میں لوگوں نے یہ اُڑا رکھا تھا کہ مرزا نوشہ (غالب) مرزا عبداللہ بیگ کے بیٹے نہیں ہیں بلکہ اُنھوں نے ان کو پال لیا ہے اور یہ دراصل کسی کشمیری کی اولاد ہیں۔ حافظ ویران نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ خدا محفوظ رکھے دہلی والوں سے جو باہر سے آیا اُس کے حسب و نسب میں اُنھوں نے کیڑے ڈالے۔ اُستاد ذوق کو شہر بھر نائی کہتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ آزاد مرحوم نے ان کے ہاتھ میں اُسترے کی بجائے تلوار دے کر ان کو سپاہی زادہ بنا دیا ہے۔

نخواہ مخواہ اِن کو آکر دق کرتے ہو۔" اُستاد نے کہا "بھئی ویرآن! تمھاری زبان نہیں رُکتی۔ بیٹھے بٹھائے تم دُنیا بھر سے لڑائی مول لیتے ہو۔" حافظ ویرآن کہنے لگے "اُستاد جب وہ آپ کو بُرا بھلا کہیں تو ہم کیوں چُپ بیٹھنے لگے وہ ایک کہیں گے تو ہم سو سنائیں گے۔ اور تو اور میاں آشفتہ کو دن لگے ہیں، کل ہی کی بات ہے کہ ناڈرا کہہ رہے تھے۔ مگر میں نے بھی ایسی خبر لی کہ تمام عمر یاد کریں گے۔ اُن کی سات پشت کو تو مو ڈالا۔" اُستاد ہنس کر فرمانے لگے۔ "نا بھئی نا، تم میری وجہ سے کیوں بلائیں پڑتے ہو۔ مجھے جس کا جو جی چاہے کہے۔" میں نے تو ان سب کا جواب ایک رُباعی میں دے دیا ہے۔

توبھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوق ہے بُرا وہ ہی کہ جو تجھ کو بُرا جانتا ہے
اور جو خود ہی تو بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے کیوں بُرا کہنے سے تُو اُن کے تو بُرا مانتا ہے

میں نے عرض کی کہ "میں کل بارگاہِ سلطانی میں حاضر ہوا تھا، حضرت ظل اللہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اس مشاعرہ میں ہم مرزا فتح الملک بہادر کو اپنی طرف سے بھیجیں گے اور اپنی غزل بھی بھیج کر مشاعرے کو عزت بڑھائیں گے۔ اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ اُستاد ذوق سے بھی کہہ دیں گے وہ بھی مشاعرے میں ضرور آئیں گے۔" یہ سن کر حافظ ویرآن تو ٹھنڈے پڑ گئے۔ اُستاد نے فرمایا "ہاں۔ بھئی مجھے یاد آگیا کل ہی شام کو حضرت پیر و مرشد نے مجھ سے فرمایا تھا اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ تو بھی ضرور جائیو۔ میاں میں انشاءاللہ تعالیٰ ضرور آؤں گا۔ مگر یہ تو بتاؤ "طرح" کیا رکھی ہے۔" میں نے

کہا کہ "حضرت ظل سبحانی نے "طرح" کا جھگڑا ہی نکال دیا۔ جو شخص جس بحر اور جس ردیف قافیہ میں چاہے آکر غزل پڑھے"۔ اُستاد تو "بہت خوب بہت خوب" کہتے رہے مگر حافظ ویران کی تیوری کے بل نہیں گئے۔ برابر بڑبڑاتے ہی رہے کہ اللہ خیر کرے دیکھئے اس مشاعرے کا کیا حشر ہوتا ہے۔ حضرت پیر و مرشد بھی بیٹھے بٹھے شگوفے[1] چھوڑا کرتے ہیں۔ وہ اپنی کہہ گئے۔ میں تو اُٹھ سلام کر چلا آیا۔

دوسرا حملہ اسداللہ خاں غالب پر تھا۔ چاندنی چوک سے ہوتا ہوا بلی ماروں میں آیا۔ حکیم محمود خاں صاحب کے مکان کے سامنے قاسم خاں کی گلی ہے۔ بائیں طرف پہلا ہی مکان ان کا تھا۔ یہ مکان مسجد کے پیچھے ہے۔ اس کے دو دروازے ہیں ایک مردانہ دوسرا زنانہ۔ محل سرا کا ایک راستہ مردانہ مکان میں سے بھی ہے۔ باہر کے دروازے کی دہلیز ذرا دھنسی ہوئی سی ہے۔ دروازہ کے اُوپر ایک کمرہ ہے اور کمرے کے دونوں پہلوؤں میں دو کوٹھڑیاں۔ گرمی میں مرزا صاحب دوپہر کے وقت اسی کوٹھڑی میں رہا کرتے ہیں۔ دروازے سے گزر کر مختصر سا صحن ہے اور سامنے ہی دالان در دالان جب میں پہنچا تو اندر کے دالان میں گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔

---

[1] معلوم نہیں کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے۔ مگر دہلی میں عام طور پر "شگوفے" کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

مرزا نوشہ کی عمر کوئی ۵۰ سال کی ہوگی۔ حسین اور خوش رو آدمی ہیں، قد اونچا اور ہاڑ بہت چوڑا چکلا، موٹا موٹا نقشہ اور سرخ و سفید رنگ ہے۔ لیکن اس میں کچھ کچھ زردی جھلکتی ہے۔ ایسے رنگ کو محاورے میں چمپئی کہا جاتا ہے۔ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ہیں، ڈاڑھی بھری ہوئی ہے۔ مگر گھنی نہیں ہے۔ سر منڈا ہوا، اس پر لمبی سیاہ پوستین کی ٹوپی ہے جو کلاہ پاپاخ سے ملتی جلتی ہے۔ ایک برکا سفید پیجامہ، سفید ململ کا انگرکھا، اس پر ہلکے زرد زمین کی جامہ وار چغہ[1]۔ میری آہٹ پاکر لکھتے لکھتے آنکھ اونچی کی۔ میں نے آداب کیا۔ سلام کا جواب دیا اور آنکھوں سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں آگئے۔ یہ امین الدین خاں صاحب نواب لوہارو کے بھائی ہیں۔ ریختے میں رخشاں اور فارسی میں نیّر تخلص کرتے ہیں۔ کوئی چالیس سال کی عمر ہے۔ انشاء پردازی، جغرافیہ، تاریخ، علم انساب، اسمائے رجال، تحقیق لغات اور واقفیت عامہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مرزا نوشہ کے خلیفہ ہیں۔ چھوٹا قد، بہت گورا رنگ، نازک نازک نقشہ، غلافی آنکھیں، چگی ڈاڑھی، چھریرا بدن، غرض نہایت خوبصورت آدمی ہیں۔ ایک برکا سفید پیجامہ اور سفید ہی انگرکھا پہنے تھے قالب چڑھی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی سر پر تھی۔ ایک بڑا رومال سموسہ بنا کر شانوں پر ڈالے ہوئے تھے۔ میں نے اٹھ کر سلام کیا انھوں نے بڑھ کر

---

[1] قلعہ دہلی کے عجائب خانہ میں مرزا غالب کی ایک تصویر ہے۔ اس سے یہ لباس لیا گیا ہے۔

مصافحہ کیا اور خاموش ایک طرف دوزانو نہایت ادب سے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں مرزا غالب بھی لکھنے سے فارغ ہوئے، پہلے نواب صاحب کی طرف مڑے اور کہنے لگے "میاں نیر تم کس وقت آ بیٹھے۔ بھئی اس مرزا تفتہ نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ظالم کی طبیعت کی روانی کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ ہر ہفتہ آٹھ دس غزلیں اصلاح کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ اصلاح دیتے دیتے تھک جاتا ہوں۔" میری طرف دیکھ کر کہا۔ "آپ شاید مولوی کریم الدین صاحب ہیں؟" میں نے کہا "جی ہاں!" فرمانے لگے۔ "حضرت آپ کے تشریف لانے کا مقصد مجھے پہلے ہی سے معلوم ہوگیا تھا۔ کل ہی میاں عارف آکر مجھ سے آپ کے مشاعرے میں چلنے کا وعدہ لے گئے ہیں۔ کہو میاں نیر! تم بھی چلو گے؟" نواب صاحب نے کہا "جہاں آپ وہاں میں۔ آپ تشریف لے جائیں گے تو انشاء اللہ میں بھی ضرور ہمراہ ہوں گا۔" مرزا صاحب نے پوچھا۔ "مگر بھئی اب تک علائی نہیں آئے۔ مجھ کو ان کا کل سے انتظار ہے۔ اے لو! وہ آ ہی گئے۔ بھئی بڑی عمر ہے ابھی میں تم کو ہی پوچھ رہا تھا۔"

نواب علاء الدین خاں، علائی نواب لوہارو کے ولیعہد ہیں۔ کوئی ۲۳، ۲۴ سال کی عمر ہے۔ متوسط قد، گندمی رنگ۔ موٹا موٹا نقشہ، گول چہرہ، شربتی آنکھیں، اور گھنی چڑھی ہوئی ڈاڑھی ہے۔ لباس میں غلطے کا تنگ مہری کا پاجامہ، سفید جامدانی کا انگرکھا، اس پر سینہ کھلی ہوئی سیاہ مخمل کی نیمہ آستین اور سر پر سیاہ مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی تھی۔ وہ بھی آداب کر کے ایک طرف بیٹھ گئے۔ اور

کہا "واقعی آج دیر ہوگئی، مجھے خود خیال تھا کہ آپ انتظار کر رہے ہونگے۔" میری طرف دیکھ کر کہا۔ "آپ کی تعریف؟" میرزا نوشہ نے تمام قصّہ بیان کیا اور کہا "علائی تم کو بھی چلنا ہوگا۔ ابھی تو شاید تم لوہارو نہیں جا رہے ہو؟" اُنھوں نے کہا "بہت خوب آپ تشریف لے جائیں گے تو میں بھی حاضر ہوں۔" جب یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا تو میں نے اجازت چاہی۔ وہاں سے رخصت ہو کر نواب زین العابدین خاں کے مکان میں آیا انھوں نے مردانے کا ایک حصّہ میرے لیے خالی کر دیا تھا۔ جو اسباب صبح میں نے بھیجا تھا اس کو جما جمایا پایا۔ کپڑے اُتارے اندر سے کھانا آیا۔ کھانا کھا کر تھوڑی دیر سو رہا۔ چار بجے کے قریب اُٹھ کر حکیم مومن خاں کے ہاں جانے کی تیاری کی۔

حکیم صاحب کا مکان چیلوں کے کوچے میں ہے۔ راستہ میں مولوی امام بخش صاحب صہبائی مل گئے۔ یہ کالج میں میرے اُستاد رہے ہیں۔ کھلا ہوا گندم گوں رنگ ہے منہ پر کہیں کہیں چیچک کے داغ ہیں۔ سر پر پٹھے ہیں۔ بڑے دُبلے پتلے آدمی ہیں کوئی ۴۰ سال کی عمر ہوگی۔ ایک برکا سفید پیجامہ، سفید انگرکھا کشمیری کام کا جبّہ، پہنتے اور سر پر چھوٹا سفید صافہ باندھتے ہیں۔ یہ بھی چیلوں کے کوچے میں ہی رہتے ہیں۔ مجھ سے پوچھنے لگے کہاں جاتے ہو۔ میں نے کہا حکیم مومن خاں کے پاس۔ پوچھا "کیا کام ہے؟" میں نے حال بیان کیا کہنے لگے۔ "چلو میں بھی وہیں جا رہا ہوں" حکیم آغا جان کے چھتّے کے سامنے

خاں صاحب کا مکان تھا۔ بڑا دروازہ ہے، اندر بہت وسیع صحن اور اُس کے چاروں طرف عمارت ہے دو طرف دو صحنچیاں ہیں اور سامنے بڑے بڑے دالان در دالان پچھلے دالان کے اوپر کمرہ ہے۔ سامنے کے دالان کی چھت کو کمرہ کا صحن کر دیا ہے لیکن منڈیر بہت چھوٹی رکھی ہے[1]۔ دالانوں میں چاندنی کا فرش ہے۔ اندر کے دالان میں بیچوں بیچ قالین بچھا ہوا ہے۔ قالین پر گاؤتکیے لگائے حکیم صاحب بیٹھے ہیں۔ سامنے حکیم سکھانند المتخلص بہ رقم اور مرزا رحیم الدین حیا مؤدب دو زانو بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دربار ہو رہا ہے کہ کسی کو آنکھ اُٹھا کر دیکھنے اور بلا ضرورت بولنے کا یارا نہیں۔ حکیم مومن خاں کی عمر تقریباً ۴۰ سال کی تھی۔ کشیدہ قامت تھے۔ سُرخ و سفید رنگ تھا جس میں سبزی جھلکتی تھی۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں، کھنچی ہوئی بھوئیں۔ لمبی ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، اُن پر پان کا لاکھا جما ہوا، مسی آلودہ دانت، ہلکی ہلکی مونچھیں، خشخاشی ڈاڑھی، بھرے بھرے بازو، پتلی کمر، چوڑا سینہ، لمبی لمبی انگلیاں، سر پہ گھونگر والے لمبے لمبے

---

[1] میں نے خود یہ مکان ۲۰، ۲۲ برس ہوئے دیکھا تھا۔ ٹوٹ کر کھنڈر ہو گیا تھا تین طرف کی عمارت ڈھے گئی تھی سامنے کا حصہ قایم تھا معلوم نہیں کہ اُوپر کی منڈیر کیوں اتنی نیچی رکھی گئی تھی اسی منڈیر سے ٹھوکر کھا کر حکیم مومن خاں نیچے گرے ہاتھ اور بازو ٹوٹ گیا اور اسی کی وجہ سے ان کا انتقال ہوا خود ہی مرنے کی تاریخ کہی تھی :—

"دست و بازو بشکست"

بال زلفیں بن کر پشت اور شانوں پر بکھرے ہیں کچھ لٹیں پیشانی کے دونوں طرف کاکلوں کی شکل رکھتی ہیں۔ کان کے قریب تھوڑے سے بالوں کو موڑ کر زلفیں بالی پر تھا۔ بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا تھا لیکن اس کے نیچے کرتہ نہ تھا۔ اور جسم کا کچھ حصّہ انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ اس میں چھوٹا سا سنہری تعویذ۔ کاکریزی رنگ کے دوپٹے کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیا تھا اور اس کے دونوں سرے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خار پشت، پاؤں میں سرخ گلبدنی کا پیجامہ، مہریوں پر سے تنگ اور اوپر جاکر کسی قدر ڈھیلا، کبھی کبھی ایک برکا پیجامہ بھی پہنتے تھے۔ مگر کسی قسم کا بھی ہو ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا۔ جوڑا سرخ نیفہ۔ انگرکھے کی آستینیں آگے سے کٹی ہوئیں۔ کبھی لٹکتی رہتی تھیں اور کبھی الٹ کر چڑھا لیتے تھے۔ سر پر گلشن کی بڑی دو پلڑی ٹوپی۔ اس کے کنارے پر باریک لیس۔ ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈھ کر آگئی تھی۔ اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصّہ اور بال صاف جھلکتے تھے۔ غرض یہ کہ نہایت خوش پوشاک اور جامہ زیب آدمی تھے۔ جب میں اور مولوی صہبائی دونوں پہنچے تو حکیم صاحب مرزا رحیم الدین حیا سے کہہ رہے تھے کہ "صاحب عالم تمھارے شطرنج کے نقشوں نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ایک ہوں دو ہوں آخر یہ روز روز کی فرمائشیں کوئی کہاں تک پوری کرے۔" صاحب عالم نے کہا "استاد کیا کروں ریذیڈنٹ بہادر کے پاس

ولایت سے شطرنج کے نقشے حل کرنے کو آیا کرتے ہیں۔ کچھ تو میں خود حل کرکے اُن کے پاس بھیج دیتا ہوں جو سمجھ میں نہیں آتے وہ آپ کے پاس لے آتا ہوں" حکیم صاحب نے نظر اُٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ ہمارا سلام لے کہا "بیٹھیے بیٹھیے" ہم بیٹھ گئے اور وہ پھر صاحب عالم کی طرف متوجہ ہوکر کہنے لگے۔ "میاں جیا! جو نقشہ تم لائے ہو وہ تو میرے خیال میں کچھ پیچیدہ نہیں ہے۔ تم کہتے ہوکہ سُرخ مُہروں کو مات ہوگی۔ میں کہتا ہوں نہیں سبز کو ہوگی۔ تم بساط بچھاؤ میں ابھی سمجھائے دیتا ہوں۔ اچھا پہلے ذرا مولوی صہبائی سے بات کرلوں اور میاں سکھانند تم بیٹھے انتظار کرتے رہو۔ میں حکم لگا چکا ہوں کہ جب تک پورب کی طرف سے اِس چھپکلی کا جوڑا نہ آجائے یہ سامنے کی دیوار سے نہ جائے گی اِس کا جوڑا آئے پر آئے" سکھانند حکیم تھے رقم تخلص کرتے تھے دھرم پورہ میں رہتے تھے۔ کوئی ۴۰ سال کی عمر تھی۔ ریختے میں شاہ نصیر کے اور رمل میں خاں صاحب کے شاگرد تھے بڑے خوش پوشاک، خوش وضع، خوش اخلاق، ظریف الطبع، حلیم، خوبصورت اور شکیل آدمی تھے۔ اُستاد کا ایسا ادب کرتے تھے جیسے کوئی بیٹا باپ کا کرتا ہے۔ حکیم صاحب کی باتیں سُن کر بہت خوب۔ بہت مناسب کہتے رہے۔ ان سے گفتگو کرکے حکیم صاحب ہماری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے "ارے بھئی صہبائی تم تو کئی دن سے نہیں آئے کہو خیریت تو ہے۔ اور آپ کے ساتھ یہ صاحب کون ہیں؟" مولوی صہبائی نے کہا "یہ پہلے کالج میں میرے شاگرد تھے اب

مطبع کھول لیا ہے وہاں مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو تکلیف دینے آئے ہیں۔" حکیم صاحب نے ہنس کر کہا۔ "دو بس۔ صاحب۔ مجھے تو معاف ہی کیجیے۔ اب دہلی کے مشاعرے شریفوں کے جانے کے قابل نہیں رہے۔ ایک صاحب ہیں وہ اپنی امت کو لے کر چڑھ آتے ہیں[1] شعر سمجھنے کی تو کسی کو تمیز نہیں۔ مفت میں واہ واہ۔ سبحان اللہ سبحان اللہ کا غل مچا کر طبیعت کو منغض کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ۔

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را　　تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

دوسرے صاحب ہیں وہ ہُدہُد کو ساتھ لیے پھرتے ہیں اور خواہ مخواہ اُستادوں پر حملہ کراتے ہیں۔ خود تو میدان میں آتے نہیں، اپنے نااہل پٹھوں کو مقابلے میں لاتے ہیں۔ اُس روز جو اس جانور نے یہ شعر پڑھ کر کہ

مرکزِ محورِ گردوں بہ لبِ آب نہیں　　ناخن قوسِ قزح شبہ مضراب نہیں

یہ کہا کہ غالب کے رنگ میں لکھا ہے تو میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھ کو کس قدر ناگوار گذرا۔ غالب کے رنگ میں شعر کہنا تو کجا وہ یا اُن کے اُستاد پہلے مرزا نوشہ کے شعروں کو سمجھ تو لیں۔ اب رہے میر صاحب[2] تو ان کی بات دوسری ہے۔ وہ بھی واہیات بکتے ہیں۔ مگر کسی پر حملہ تو نہیں کرتے۔ بلکہ ان کی وجہ سے مشاعرے میں

---

[1] یہ اُستاد ذوق اور شہزادوں کی طرف اشارہ تھا۔

[2] ان کا مفصل حال آگے آئے گا۔ یہ بھی عجیب رقم تھے۔

کچھ چہل پہل ہو جاتی ہے۔ بھئی میں نے تو اسی وجہ سے مشاعروں میں جانا ہی ترک کر دیا ہے۔" میں نے عرض کی کہ "اس مشاعرے میں اُستاد ذوقؔ اور مرزا نوشہ نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ حضرت ظلِ سبحانی کی غزل بھی آئے گی۔" فرمایا "ہر شخص مختار ہے چاہے خود آئے چاہے غزل بھیجے۔ میں تو نہ آؤں گا نہ غزل بھیجوں گا۔"
یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک بنارس کا سوداگر کپڑوں کے دو گٹھے لے کر آیا۔ شہر میں جب کوئی کپڑوں کا سوداگر آتا تو حکیم صاحب کے پاس اس کا آنا لازمی تھا۔ ریشمی کپڑوں سے ان کو عشق تھا۔ کوئی کپڑا پسند آتا تو پھر قیمت کی پروا نہیں کرتے تھے۔ جو مانگتا دیتے۔ اس سوداگر نے آ کر ایک گٹھڑی مزدور کے سر پر سے اُتاری اُس میں سے یٹ سے ایک چھپکلی نیچے گری اور دوڑ کر سامنے کی دیوار پر چڑھ گئی، جو چھپکلی پہلے سے دیوار پر جمی بیٹھی تھی وہ لپک کر اُس سے آ ملی اور دونوں مل کر ایک طرف چلے گئے[۱] ہم لوگ بیٹھے یہ تماشا دیکھتے رہے۔ جب دونوں چھپکلیاں چلی گئیں تو حکیم صاحب نے سکھانند صاحب سے کہا "کہو، میاں رقمؔ تم نے دیکھا؟" اُنھوں نے کہا "جی ہاں ایک خانہ کے حساب لگانے میں مجھ سے غلطی۔ میں نے جو اپنی رائے پر اصرار کیا تھا اُس کی معافی چاہتا ہوں۔" کہنے لگے۔ "اس کا خیال نہ کرو انسان ہی سے

---

[۱] یہ واقعہ ہے اس کے دیکھنے والے ایک صاحب کا ابھی کوئی بیس برس ہوئے انتقال ہوا ہے میں نے یہ واقعہ خود ان کی زبانی سُنا ہے۔

غلطی ہوتی ہے۔ ہاں تو میاں صہبائی مشاعرے کے متعلق ہمارا تو صاف جواب ہے۔" میں نے جب دیکھا کہ خاں صاحب ہاتھوں سے نکلے ہی جا رہے ہیں تو مجھے نواب زین العابدین خاں کا آخری نسخہ یاد آیا۔ میں نے کہا۔ "مجھے تو اس مشاعرے سے برائے نام تعلق ہے سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں عارف کا ہے۔ وہ بہت بیمار ہو گئے ہیں اور اب اُن کو زندگی کی اُمید نہیں رہی۔ اُن کی آخری خواہش ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لیں جس میں دہلی کے تمام کاملین فن جمع ہوں۔ وہ خود حاضر ہوتے۔ مگر حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے اُن کو کہیں آنے جانے سے منع کر دیا ہے۔" یہ آخری فقرہ میں نے اپنی طرف سے بڑھا دیا۔ خاں صاحب بڑے غور سے میری بات سنتے رہے۔ میں خاموش ہوا تو مولوی امام بخش صاحب کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے۔ "افسوس ہے۔ کیا خوش فکر اور ذہین شخص ہے یہ عمر اور یہ مایوسی۔ سچ ہے ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔" میری طرف دیکھ کر کہا۔ "اچھا بھئی تم جاؤ میری طرف سے عارف سے کہہ دینا کہ میاں میں ضرور آؤں گا۔" جب میں نے دیکھا کہ یہ جادو چل گیا تو اور پاؤں پھیلائے اور کہا۔ "نواب صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ مولوی صہبائی صاحب، مفتی صدر الدین صاحب اور نواب مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہ کو بھی اپنے ہمراہ لائیے گا تو عنایت ہوگی۔" حکیم صاحب کہنے لگے۔ "میاں صہبائی سے تو میں ابھی کہے دیتا ہوں، اب رہے آزردہ اور شیفتہ تو واپس جاتے جاتے راستہ میں اُن سے بھی

کہتے جاؤ۔ کہہ دینا کہ میں نے تم کو بھیجا ہے۔ ہاں تاریخ کیا مقرر کی ہے۔ مشاعرہ کہاں ہوگا اور "طرح" کیا ہے؟" میں نے تاریخ بتاکر مکان کا پتہ دیا۔ "طرح" کے متعلق حضرت جہاں پناہ کے حضور میں جو گفتگو ہوئی تھی وہ بیان کی۔ کہنے لگے "ہمارے بادشاہ سلامت بھی عجیب چیز ہیں، جو سوجھتی ہے نئی سوجھتی ہے۔ شاید ایسا مشاعرہ کہیں بھی نہ ہوا ہوگا جس میں "طرح" نہ دی گئی ہو۔ خیر یہ تو اچھا ہوا کہ جھگڑے کا جھونپڑا ہی نہیں رہا۔ مگر بھئی بات یہ ہے کہ جب تک مقابلے کی صورت نہ ہو نہ شعر کہنے میں جی لگتا ہے اور نہ پڑھنے میں لطف آتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ کپڑے دیکھنے میں مشغول ہو گئے اور میں سلام کر کے رخصت ہوا۔

چتلی قبر کے قریب حویلی عزیز آبادی کے سامنے مفتی صدر الدین صاحب کا مکان ہے۔ اس کے نزدیک مٹیا محل میں نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ رہتے ہیں۔ مفتی صاحب کے ہاں جاکر معلوم ہوا کہ شیفتہ بھی مفتی صاحب ہی کے پاس بیٹھے ہیں۔ میں نے کہا چلو اس سے بہتر موقع ملنا مشکل ہے دونوں سے ایک ہی جگہ ملنا ہو گیا یہ سوچ کر اندر گیا۔ مکان کوٹھی کے نمونے کا ہے۔ انگریزی اور ہندوستانی دونوں وضع کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ صحن بہت بڑا نہیں ہے۔ اس میں مختصر سی نہر ہے۔ سامنے دالان در دالان اور پہلو میں انگریزی وضع کے کمرے ہیں۔ دالانوں سے ملا ہوا اونچا صحن چبوترہ ہے چبوترے کے اوپر تخت بچھے ہوئے تھے۔ ان پر چاندنی کا فرش اور دو طرف گاؤ تکیے

لگے ہوئے تھے تختوں پر مفتی صاحب اور نواب صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے مفتی صاحب کی عمر کوئی ۵۶، ۵۷ سال کی تھی۔ گداز جسم، سانولا رنگ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئیں، بھری ڈاڑھی، بہت سیدھی سادی وضع کے آدمی ہیں۔ ظاہری نمائش سے کوئی سروکار نہیں۔ بدن میں سفید ایک بر کا پیجامہ، سفید کرتہ اور سفید ہی عمامہ تھا[له] جامہ زیبی میں حکیم مومن خاں کے بعد دہلی میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ ہی کا نمبر تھا، ان کا رنگ سانولا تھا، لیکن ناک نقشہ غضب کا پایا تھا۔ اس پر بیچی سیاہ گول ڈاڑھی بہت ہی بھلی معلوم ہوتی تھی جسم کسی قدر بھاری اور قد متوسط تھا۔ لباس میں بھی زیادہ تکلف نہیں تھا۔ تنگ مہری کا سفید پیجامہ، سفید کرتا، نیچی چولی کا سفید انگرکھا اور قبہ نما پچگوشیہ ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ تقریباً ۳۹، ۴۰ سال کی عمر ہے۔

له پرانے زمانہ میں شرفا گھر پر بھی پورا لباس پہنے رہتے تھے۔ زنانے میں جانے کے خاص خاص وقت تھے ورنہ سارا وقت مردانہ ہی میں گذرتا تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی ملنے جلنے والا پاس بیٹھا رہتا۔ عالم ہوئے تو درس کا حلقہ ہوتا۔ شاعر ہوئے تو شعر کا چرچا رہتا غرض کوئی وقت بیکار نہ گذرتا خاص خاص دوستوں سے مذاق کی گفتگو ہوتی ورنہ عام طور پر اپنے کو بہت لیے دیے رہتے، جاؤ بھی معلوم ہوتا کہ دربار لگا ہوا ہے ہر شخص دوزانو مودب بیٹھا ہے، بے ضرورت نہ بات کی جاتی ہے نہ جواب دیا جاتا ہے۔ کوئی ہنسی کی بات ہوئی تو ذرا مسکرا دیے کھلکھلا کر ہنسنا معیوب اور بڑھ بڑھ کر بولنا یا اونچی آواز میں بات کرنا خلاف ادب سمجھا جاتا تھا۔

میں آداب کر کے تخت کے ایک کونے پر دوزانو بیٹھ گیا۔ مفتی صاحب نے آنے کا سبب پوچھا۔ میں نے حکیم مومن خاں کا پیام پہنچا دیا۔ مفتی صاحب نے بڑے تعجب سے پوچھا۔ کہا "ہیں! خاں صاحب نے تو مشاعرے میں نہ جانے کا عہد کر لیا ہے۔ بھئی شیفتہ! یہ کیا معاملہ ہے؟ یا تو خود نہیں جاتے تھے یا دوسروں کو بھی ساتھ گھسیٹ رہے ہیں۔" میں نے نواب زین العابدین خاں عارف کا واقعہ بیان کیا۔ کہنے لگے "ہاں یوں کہو، یہ بات ہے ورنہ مجھے تو یہ سُن کر حیرت ہوئی تھی کہ حکیم صاحب اور مشاعرے میں جائیں۔ اچھا بھئی۔ عارف سے کہہ دینا کہ میں اور شیفتہ دونوں آئیں گے۔" یہاں سے چھٹی ہوئی تو میں یہ سمجھا کہ گویا گنگا نہا لیا۔ خوشی خوشی آکر نواب زین العابدین خاں سے واقعہ بیان کیا وہ بھی مطمئن ہو گئے میں نے حکیم مومن خاں کا جب حال بیان کیا تو اُن کے آنسو نکل آئے۔ کہنے لگے۔ "میاں کریم الدین تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ میری حکیم صاحب سے صفائی نہیں ہے۔" میں نے کہا "نواب صاحب! یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ ان پر تو آپ کی بیماری سُننے کا ایسا اثر ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ شاید ان کا سگا بھائی بھی بیمار ہوتا تو اتنا ہی اثر ہوتا۔ مفتی صاحب سے معلوم ہوا کہ انھوں نے مشاعروں میں نہ جانے کا عہد کر لیا تھا، صرف آپ کی وجہ سے انھوں نے یہ عہد توڑا۔" نواب صاحب نے کہا "میاں تم کو ان لوگوں کی نیتوں کا کیا حال معلوم۔ یہ لوگ وہ ہیں کہ اپنے دشمن کو بھی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتے۔ خیر اس کو جانے دو۔ اب یہ بتاؤ کہ تمھارا امکان خالی

ہوگیا یا نہیں۔ میں نے کہا جی ہاں بالکل خالی ہے۔ حکم ہو تو میں بھی خدمت میں حاضر رہ کر مدد کروں۔" فرمایا "نہیں۔ بھئی۔ نہیں۔ جہاں دو آدمیوں نے مل کر کسی کام میں ہاتھ ڈالا اور وہ خراب ہوا۔ تم اس انتظام کو بس مجھ پر ہی چھوڑ دو، بلکہ تم تو اُدھر آنا بھی نہیں، تم نے اگر آکر مین میخ نکالی تو مجھ پر دُہری تہری محنت پڑ جائے گی۔"

۳۔ ترتیب

بہ شعر و سخن مجلس آراستند نشستند و گفتند و برخاستند

میں تاریخ ابوالفداء کے ترجمے میں ایسا گتھ گیا کہ ۷، ۸ روز تک گھر سے باہر ہی نہیں نکلا۔ نواب زین العابدین خاں کے شوق کی یہ حالت تھی کہ باوجود کمزوری و نقاہت کے روز صبح ہی سے جو باہر نکلتے تو کہیں رات کے آٹھ نو بجے جاکر گھر میں اُن کی صورت دکھائی دیتی، اس لیے ان سے ملنا نہیں ہوا کہ کچھ حال پوچھتا۔ بہر حال یہ آٹھ دن آنکھ بند کرتے گذر گئے اور مشاعرے کی تاریخ آہی گئی۔ ۱۴ رجب کو شام کے ساڑھے سات بجے کے قریب میں بھی مشاعرے میں جانے کو تیار ہوا۔ نواب صاحب کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ صبح سے جو گئے ہیں تو اب تک واپس نہیں آئے۔ گھر سے جو نکلا تو بازار میں بڑی چہل پہل دیکھی۔ ہر شخص کی زبان پر مشاعرے کا ذکر تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ میاں کریم الدین کون ہیں، کوئی کہتا کہ اس سے کیا۔ کوئی ہوں۔ مگر انتظام ایسا کیا ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ میں یہ باتیں سنتا اور دل میں

خوش ہوتا ہوا قاضی کے حوض پر آیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سڑک کے دونوں جانب ٹٹیاں لگا کر اور اُن میں روشنی کے گلاس جما کر رات کو دن کردیا ہے۔ سڑک پر خوب چھڑکاؤ ہے، کٹورا بج رہا ہے۔ مبارک النسا بیگم کی حویلی کے بڑے پھاٹک کو گلاسوں قمقموں اور قندیلوں سے سجا کر گلزار آتشیں کردیا ہے۔ صدر دروازے سے اندر کی دہلیز تک روشنی کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں میں چکا چوند آتی ہے۔ مکان کے اندر جو قدم رکھا تو ہوش جاتے رہے۔ یا اللہ یہ میرا ہی مکان ہے یا کسی شاہی محل میں آگیا ہوں۔ گھڑی گھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتا اور کہتا، واہ میاں عارف واہ! تم نے تو کمال کردیا۔ کہاں بیچارے کریم الدین کا مکان اور کہاں یہ بادشاہی ٹھاٹھ، واقعی تمہارا کہنا صحیح تھا کہ اگر دو ہزار میں بھی کام نکل جائے تو یہ سمجھو کہ کچھ نہیں اُٹھا۔ چونے میں ابرک ملا کر مکان میں قلعی کی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے در و دیوار بڑے جگ مگ، جگ مگ کر رہے تھے۔ صحن کو بھروا کر تختوں کے چوکے اس طرح بچھائے تھے کہ چبوترہ اور صحن برابر ہوگئے تھے۔ تختوں پر دری، چاندنی کا فرش، اُس پر قالینوں کا حاشیہ۔ پیچھے گاؤ تکیوں کی قطار، جھاڑوں، فانوسوں، ہانڈیوں، دیوار گیریوں، قمقموں، چینی قندیلوں اور گلاسوں کی وہ بہتات تھی کہ تمام مکان بقعۂ نور بن گیا تھا۔ جو چیز تھی خوبصورت اور جو شے تھی قرینے سے۔ سامنے کی صف کے بیچوں بیچ چھوٹا سا سبز مخمل کا، کارچوبی شامیانہ گنگا جمنی چوبوں پر سبز ہی ریشمی طنابوں سے استادہ تھا۔

اس کے نیچے سبز مخمل کی کار چوبی مسند، تکیے پیچھے سبز کار چوبی گاؤ تکیہ، چاروں چوبوں پر چھوٹے چھوٹے آٹھ چاندی کے فانوس کسے ہوئے! فانوسوں کے کنول بھی سبز۔ چوبوں کے سنہری کلسوں سے لگا کر نیچے تک موٹے موٹے موتیا کے گجرے سہرے کی طرح لٹکے ہوئے۔ بیچ کی لڑیوں کو سمیٹ کر کلا بتونی ڈوریوں سے جن کے سروں پر مقیش کے گچھے تھے اس طرح چوبوں پر کس دیا گیا تھا کہ شامیانے کے چاروں طرف پھولوں کے دروازے بن گئے تھے۔ دیواروں میں جہاں کھونٹیاں تھیں وہاں کھونٹیوں پر اور جہاں کھونٹیاں نہیں تھیں وہاں کیلیں گاڑ کر پھولوں کے ہار لٹکا دیے تھے۔ اس سرے سے لگا کر اُس سرے تک سفید چھت گیری جس کے حاشیے سبز تھے کھنچی ہوئی تھی۔ چھت گیری کے بیچوں بیچ موتیا کے ہار لٹکا کر لڑیوں کو چاروں طرف اس طرح کھینچ دیا تھا کہ پھولوں کی چھتری بن گئی تھی۔ ایک صحنچی میں پانی کا انتظام تھا، کورے کورے گھڑے رکھے تھے اور شورے میں جست کی صراحیاں لگی ہوئی تھیں۔ دوسری صحنچی میں پان بن رہے تھے۔ باورچی خانہ میں حقوں کا تمام سامان سلیقے سے جما ہوا تھا۔ جا بجا نوکر صاف ستھرا لباس پہنے دست بستہ مودب کھڑے تھے۔ تمام مکان مشک و عنبر اور اگر کی خوشبو سے پڑا مہک رہا تھا۔ قالینوں کے سامنے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر حقوں کی قطار رکھی تھی ایسے

لہ سبز رنگ دہلی کا شاہی رنگ تھا۔

صاف ستھرے تھے کہ معلوم ہوتا تھا ابھی دوکان پر سے اٹھ کر آئے ہیں۔ حقوں کے بیچ میں جو کچھ جگہ چھوٹ گئی تھی وہاں چھوٹی چھوٹی تپائیاں رکھ کر ان پر خاص دان رکھ دیے تھے۔ خاص دانوں میں لال قند کی صافیوں میں لپٹے ہوئے پان۔ گلوریوں کو صافی میں اس طرح جمایا تھا کہ بیچ میں ایک ایک تہ پھولوں کی آگئی تھی۔ خاص دانوں کے برابر چھوٹی چھوٹی کشتیاں۔ ان میں الائچیاں۔ چکنی ڈلیاں اور پن دھنیا۔ مسند کے سامنے چاندی کے دو شمع دان۔ اندر کافوری بتیاں، اوپر ہلکے سبز رنگ کے چھوٹے کنول شمع دانوں کے نیچے چاندی کے چھوٹے لگن، لگنوں میں کیوڑا۔ غرض کیا کہوں ایک عجیب تماشا تھا۔ میں تو الف لیلیٰ کا ابوالحسن ہو گیا۔ جدھر نظر جاتی ادھر ہی کی ہو رہتی[1]۔ میں اس تماشے میں محو تھا کہ لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

سب سے پہلے مرزا کریم الدین رسا آئے۔ یہ سلاطین زادے ہیں، کوئی ستر برس کے پیٹے میں ہیں۔ استعداد علمی تو کم ہے مگر شاعری میں اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتے۔ بہت رحم دل، خوش خلق اور سادہ مزاج ہیں۔ دغل فصل نام کو نہیں ہے۔ ملاح کہا کرتے ہیں کہ کشتی میں "چڑھے سب سے پہلے اور اترے سب سے پیچھے"۔ انھوں نے اس مقولہ کو مشاعرے سے متعلق کر دیا ہے۔ مشاعرے

---

[1] بزرگوں کی زبانی دیوان عام کے مشاعروں کا جو حال میں نے سنا ہے بجنسہ اسی پر اس مشاعرے کا نقشہ قایم کیا ہے۔

میں سب سے پہلے آتے ہیں اور جب تک ایک ایک کر کے سب نہیں
چلے جاتے یہ اُٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ
مشاعرہ ہو رہا تھا۔ بڑے زور سے ابر آیا۔ سب نے جلدی جلدی
مشاعرہ ختم کیا لوگ اپنے اپنے گھر گئے۔ لیکن یہ ٹھیرے اپنی وضع
کے پابند جب تک سب نہ جا چکے اپنی جگہ سے نہ اُٹھے۔ ہاں
گھڑی گھڑی جھک جھک کر آسمان دیکھ لیتے۔ اتنے میں موسلادھار
مینھ برسنا شروع ہوا۔ ایسا برسا کہ جل تھل بھر گئے۔ کہیں دو گھنٹے
کے بعد خدا خدا کر کے ذرا مینھ تھما تو یہ بھی اُٹھے۔ مگر ایسا اندھیرا
گھپ تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا تھا۔ مالکِ مکان نے ایک نوکر
کو قندیل دے کر ساتھ کر دیا۔ گلیوں میں ٹخنوں ٹخنوں پانی تھا،
ان بیچارے کے پاؤں میں زر دوزی کا قیمتی جوتا۔ کیچڑ میں پاؤں
رکھیں تو کیسے رکھیں۔ آخر چپکے سے نوکر سے کہا کہ تو اپنا جوتا مجھے
دے دے۔ اس کا جوتا کیا تھا لیتڑے تھے وہی گھسیٹتے ہوئے
چلے۔ اپنا جوتا بغل میں دبا لیا۔ قلعہ پہنچ کر ایک نیا جوتا نوکر کو دیا اور
کہا۔ ”میاں۔ تو نے آج میرے ساتھ ایسا احسان کیا ہے کہ تمام
عمر نہ بھولوں گا۔ جب کبھی تجھے کوئی ضرورت ہو تو میرے پاس آجایا
کیجیو“ آگے چل کر اس بدمعاش نے ان کو بہت دق کیا۔ اول تو
راز کا ڈھنڈورا پیٹ دیا۔ دوسرے ہر تیسرے چوتھے ان سے
ایک دو روپے مار لاتا۔ مگر انھوں نے کبھی ”نا“ نہیں کی۔ جب
جاتا کچھ نہ کچھ سلوک ضرور کر دیتے۔

نواب زین العابدین خاں صاحب نے بڑھ کر لب فرش اُن کو

لیا۔ اور پوچھا "ہیں صاحب عالم! میاں حیا آپ کے ساتھ نہیں آئے" مرزا رحیم الدین حیا ان کے بڑے بیٹے ہیں۔ لیکن تھوڑے دنوں سے باپ بیٹے میں کچھ صفائی نہیں رہی ہے۔ نواب صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ صاحب عالم ناسور کی طرح پھوٹ بہے۔ کہنے لگے۔ "نواب! وہ بھلا میرے ساتھ کیوں آنے۔ جب سے بنارس ہو کر آئے ہیں ان کا تو رنگ ہی بدل گیا۔ میں بیچارہ تو کس گنتی میں ہوں وہ کسی کو بھی اب خاطر میں نہیں لاتے۔ پالا، پوسا، بڑا کیا، پڑھایا، لکھایا، شاعر بنایا، بٹیریں لڑانا سکھایا اور تخت[1] کی قسم وہ وہ نسخے بٹیروں کے بتائے ہیں کہ قلعہ تو قلعہ ہندوستان بھر میں کسی کے فرشتے خاں کو بھی معلوم نہ ہونگے، اور اب وہی صاحبزادے صاحب ہیں کہ استاد ماننا تو درکنار مجھ کو باپ بھی کہتے شرماتے ہیں۔ ہاں بھئی کیوں نہ ہو تیرہویں صدی ہے۔ ان کو بنارس بھیج کر میں تو مصیبت میں آگیا۔ ایک نقصان مایہ، دوسرے شماتت ہمسایہ۔ بیٹا ہاتھ سے گیا تو گیا، دن رات کی داتا کلکل اور مول لے لی۔" یہ باتیں کرتے کرتے نواب صاحب نے میاں رسا کو لے جا ایک جگہ بٹھا دیا۔ ان سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ شہزادوں کا ایک گروہ حافظ عبدالرحمٰن احسان کو جھرمٹ میں لیے آپہنچا۔

---

[1] آئے دن کی خانہ جنگیوں نے ہر شہزادہ کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ شاید کل میں ہی بادشاہ ہو جاؤں، اس لیے قلعہ کے سب لوگ خواہ وہ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے ہمیشہ تخت کی، تاج کی اور اسی طرح کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔

بھلا دِلّی شہر میں کون ہے جو "حافظ جیو" کو نہ جانتا ہو۔ جگت اُستاد ہیں۔ پہلے تو قلعہ کا قافیہ اُن کا شاگرد تھا۔ مگر اُستاد ذوق سے قلعے میں قدم رکھتے ہی ان کا زور ذرا ٹوٹا۔ یہ بھی زمانہ کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے اور شاہ نصیر سے ٹکرا چکے تھے۔ اس بڑھاپے میں بھی تم ٹھوک کر سامنے آگئے اور مرتے دم تک مقابلے سے نہ ہٹنا تھا نہ ہٹے کوئی ۹ برس کی عمر تھی کمر دُہری ہونے سے قد کمان بن گیا تھا۔ اپنے زمانہ کے بلعم باعور تھے لیکن غزل اس کڑاکے سے پڑھتے تھے کہ تمام مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ ان کی اُستادی کا سکہ ایک زمانہ سے تمام دلّی پر بیٹھا ہوا تھا۔ پہلے مرزا نیلی کے اُستاد ہوئے۔ رفتہ رفتہ شاہ عالم بادشاہ غازی نور اللہ مرقدہٗ تک رسائی ہوگئی وہ ان کو "حافظ جیو" کہتے تھے اس لیے اس نام سے تمام قلعہ میں مشہور تھے مصرع پر مصرع لگانے میں کمال تھا اور سند ایسی تراخ سے دیتے تھے کہ معترض مُنہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ ایک روز بادشاہ سلامت نے مصرع کہا

صبح بھی بوسہ تو دیتا مجھے اے ماہ نہیں

اُنھوں نے فوراً عرض کی

نامناسب ہے میاں وقت سحرگاہ نہیں

کسی نے "وقتِ سحرگاہ" کی ترکیب پر اعتراض کیا اُنھوں نے جھٹ صائب کا یہ شعر پڑھا

آدمی پیر چو شد حرص جواں می گردد
خواب در وقتِ سحرگاہ گراں می گردد

بڑے دُبلے پتلے آدمی تھے۔ رنگ بہت کالا تھا، شاہ نصیر نے اسی رنگ کا خاکہ اس طرح اُڑایا ہے۔

اے خال رُخ یار تجھے ٹھیک بناتا
پر چھوڑ دیا حافظ قرآں سمجھ کر

نواب صاحب نے ان سب کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی اپنی جگہ لا بٹھایا۔ ابھی ان کو بٹھلانے سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ منشی محمد علی تشنہ، جَم ننگے، نشے میں چور جھومتے جھامتے اندر آئے۔ نوجوان آدمی ہیں۔ مگر عجب حال ہے کبھی برہنہ پڑے پھرتے ہیں۔ کبھی کپڑے پہن، خاصے بھلے آدمی بن جاتے ہیں کسی کے شاگرد نہیں۔ اور پھر سب کے شاگرد ہیں۔ کبھی حکیم آغا جان عیش سے اصلاح لینے لگتے ہیں کبھی اُستاد ذوق کے پاس اصلاح کے لیے غزل لے آتے ہیں۔ ذہن بلا کا پایا ہے، لاکھوں شعر زبان کی نوک پر ہیں۔ شعر سُنا اور یاد ہوا۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی کی غزل سُنی اور یاد کر لی۔ مشاعرے میں خود اپنے نام سے وہ غزل پڑھ ڈالی اور وہ بیچارہ مُنہ دیکھتا رہ گیا۔ نواب صاحب آگے بڑھے، پوچھا۔ "منشی جی یہ کیا رنگ ہے" کہنے لگے "اصلی رنگ۔ مشاعرہ کب شروع ہوتا ہے" نواب صاحب نے کہا "ابھی شروع ہوتا ہے۔ آپ بیٹھیے تو سہی" خیر ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ میاں عارف نے اُن پر ایک دوشالہ لا کر ڈال دیا۔ اُنھوں نے اٹھا کر پھینک دیا۔ غرض جس طرح ننگے آئے تھے بلا تکلف بیٹھے رہے۔ اس کے بعد تو لوگوں کے آنے کا تانتا بندھ گیا۔ جو آتا اُس کا استقبال نواب صاحب

کرتے اور لا لا کر بٹھاتے۔ حکیم مومن خاں آئے ان کے ساتھ آزردہ شیفتہ، صہبائی اور مولوی مملوک العلی تھے۔ مولوی صاحب مدرسہ دہلی میں مدرس اول ہیں۔ عجیب باکمال آدمی ہیں۔ مدرسہ میں ان کی ذات بابرکات سے وہ فیض ہوا ہے کہ شاید ہی کسی زمانہ میں کسی اُستاد سے ہوا ہو۔ بہت پابند شرع ہیں، اس لیے خود شعر نہیں کہتے۔ مگر سمجھتے ایسا ہیں کہ ان کا کسی شعر کی تعریف کر دینا گویا اس کو دوام کی سند دے دینا ہے۔ کوئی ۶۰ سال کا سن ہے۔ رہنے والے نانوتے کے ہیں مگر مدتوں سے دہلی میں آرہے ہیں۔ دن رات پڑھنے پڑھانے سے کام ہے۔ مشاعروں میں کم جاتے ہیں۔ یہاں شاید مولانا صہبائی ان کو اپنے ساتھ گھسیٹ لائے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے بیچارے پابندی شروع اور تقوی کی وجہ سے چکر میں آگئے تھے۔ ہوا یہ کہ رزیڈنٹ بہادر مدرسہ کے معائنہ کو آئے۔ ان کے علم اور رُتبے کے خیال سے ہاتھ ملایا جب تک صاحب بہادر وہاں رہے اُنھوں نے ہاتھ کو جسم سے اس طرح الگ رکھا جیسے کوئی نجس چیز کو دور رکھتا ہے۔ صاحب کے جاتے ہی بہت احتیاط سے ہاتھ کئی بار دھویا۔ کسی نے جاکر صاحب سے یہ بات لگادی۔ اُن کو بہت غصہ آیا کہ ہم نے تو ہاتھ ملاکر اُن کی عزت افزائی کی اُنھوں نے اس طرح ہماری توہین کی۔ غرض بڑی مشکل سے یہ معاملہ رفع دفع ہوا[1]

---

[1] اس واقعہ کا ذکر ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم نے ابن الوقت میں کیا ہے۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۶ پر)

مولوی صاحب میرے بھی اُستاد تھے۔ میں بھی آگے بڑھا۔ آداب کیا۔ فرمانے لگے "میاں کریم الدین۔ میں تم کو ایسا نہ سمجھا تھا۔ تم نے تو دہلی والوں کو بھی مات کر دیا۔ سُبحان اللہ سبحان اللہ! کیا انتظام ہے۔ دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ خدا تمھیں اس سے زیادہ حوصلہ دے۔" میں نے عرض کیا۔ "مولوی صاحب بھلا میں کیا اور میری بساط کیا۔ یہ سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں کا ہے۔" فرمانے لگے۔ "بھئی یہ بھی اچھی ہوئی۔ وہ کہیں کہ سارا انتظام کریم الدین خاں کا ہے۔ تم کہو نواب صاحب کا ہے۔ چلو، "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو۔" ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مرزا نوشہ پالکی میں سے اُترے۔ نیرؔ، علائیؔ، سالکؔ اور حزیںؔ اُن کے ہمراہ تھے۔ مرزا غالبؔ آتے ہی مومن خاں کی طرف بڑھے، مصافحہ کیا اور کہا۔ "بھئی۔ حکیم صاحب آج محمد ناصر جان محزوںؔ کا عظیم آباد سے خط آیا تھا۔ تم کو بہت بہت سلام لکھا ہے۔ معلوم نہیں کہ کیوں ایکا ایکی پٹنہ چلے گئے۔ خواجہ میر دردؔ کے پوتے ہو کر ان کا دہلی کو چھوڑنا ہم کو تو پسند نہیں آیا۔ اب یاروں کو روتے ہیں۔ دیکھا کیا درد بھرا شعر لکھا ہے۔

نہ تو نامہ ہی نہ پیغام زبانی آیا
آہ محزوںؔ مجھے یارانِ وطن بھول گئے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) مگر نام نہیں لکھا۔ مجھے یہ واقعہ اُن ہی کی زبانی معلوم ہوا۔ سُن کر تعجب ہوا تھا۔ اب ایسے بہت سے لوگوں کو خود اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔

ارے بھئی، رات تو خاصی آگئی ہے۔ ابھی تک میاں ابراہیم نہیں آئے۔ آخر یہ مشاعرہ شروع کب ہوگا؟" حکیم صاحب کچھ جواب دینے ہی والے تھے کہ دروازے کے پاس سے "السلام علیکم" کی آواز آئی۔ مولانا صہبائی نے کہا۔ "اے لیجیے۔ مرزا صاحب وہ اُستاد کے نشان کے ہاتھی حافظ ویران صاحب آگئے اور وہ آپ کے دوست ہُدہُد بھی ساتھ ہیں، دیکھیے آج کس کے چونچ مارتے ہیں۔"

میاں ہُدہُد کا نام عبدالرحمٰن ہے۔ پورب کے رہنے والے ہیں۔ دہلی میں آکر حکیم آغا جان عیش کے یہاں ٹھیر گئے ہیں۔ اُن کے بچّوں کو پڑھاتے ہیں۔ حکیم صاحب ہی کے مشورے سے ہُدہُد تخلص اختیار کیا۔ اُنھی کی تجویز سے مُچھگی ڈاڑھی رکھی۔ سر منڈا کر ٹکو عمامہ باندھا اور اس طرح خاصے کھٹ بڑھی ہوگئے۔ انھی کے ذریعے سے دربار میں پہنچے اور "طائرالاراکین شہپرالملک ہُدہُد الشعرا منقار جنگ بہادر" خطاب پایا۔ شروع میں تو ان کے ظریفانہ کلام سے مشاعرہ چمک جاتا تھا۔ مگر بعد میں اُنھوں نے اُستادانِ فن پر حملے شروع کر دیے۔ کہتے تو یہ ہیں کہ حکیم صاحب کے اشارہ سے ایسا کیا، لیکن کچھ بھی ہو، آخر آخر میں سب کو اُن سے کچھ نفرت سی ہوگئی۔ اور بجائے اس کے کہ یہ دوسروں کا مذاق اُڑاتے۔ خود ان کا مذاق اُڑ جاتا تھا۔ حکیم صاحب علانیہ تو اُن کی مدد کر نہیں کرسکتے تھے۔ خود اُن میں اتنی قابلیت نہ تھی جو دلّی والوں کی پھبتیوں کو سنبھال سکتے۔ تھوڑی ہی دیر میں ٹھنڈے ہوکر رہ جاتے۔ مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں کے ہمیشہ مُنہ آتے تھے۔ اسی لیے مولانا صہبائی

کے مُنہ سے "آپ کے دوست" کا لفظ سُن کر مرزا نوشہ مُسکرائے اور کہا "بھئی۔ میں تو ان کے مُنہ کیوں لگنے لگا مگر آج دیکھا جائیگا۔ "ہر فرعونے راموسیٰ"۔ سُنتا ہوں کہ ہمارے میر صاحب مولوی ہُدہُد کی شان میں آج کچھ فرمانے والے ہیں۔ ان کے سامنے اگر یہ شہباز سُخن ٹک گئے تو میں سمجھوں گا بڑا کام کیا۔" غرض یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اُستاد ذوق بھی اندر آگئے۔ تمام قلعہ اُن کے ساتھ اُلٹ آیا تھا۔ صاحب سلامت کرکے سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ قلعہ والوں اور ان لوگوں میں جن کا تعلق قلعہ سے ہے سلام کرنے کا کچھ عجیب طریقہ ہے۔ سیدھے کھڑے ہوکر دایاں ہاتھ اس طرح کان تک لے جاتے ہیں جس طرح کوئی نماز کی نیت باندھتا ہے اور پھر چھوڑ دیتے ہیں۔ چلو سلام ہوگیا۔ باقی سب لوگوں سے معمولی طرح سلام کرتے ہیں۔ قلعہ والوں کی صورت کچھ ایسی ہے کہ ایک ہی نظر میں پہچان لیے جاتے ہیں۔ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے سب کی وضع قطع ایک سی ہے۔ وہی لمبی گردن، وہی پتلی اونچی ناک، لمبا کتابی چہرہ، بڑی بڑی لمبوتری آنکھیں، بڑا دہانہ، اُونچا چوکا، آنکھوں کے نیچے کی اُبھری ہوئی ہڈیاں، گہرا سانولا رنگ، ڈاڑھی کلّوں پر ہلکی، ٹھوڑی پر زیادہ۔ غرض جیسی مشابہت ان لوگوں میں ہے شاید ہی کسی خاندان والوں میں ہوگی۔ امیر تیمور سے لگا کر اس وقت تک ان کی شکل میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، پہلے تو قلعہ بھر کا ایک ہی

لباس[1] تھا۔ مگر اب دو رنگی ہوگئی ہے۔ وجہ یہ ہوئی ہے کہ جب

---

[1] اس مضمون میں جابجا دہلی والوں کے لباس کا ذکر آیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذرا وضاحت سے اس لباس کو بتا دوں تاکہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے اُس محفل کا نقشہ اور اچھی طرح پھر جائے۔ مرزا نوشہ کا تو ذکر جانے ہی دو وہ تو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتے ہیں۔ ان کی ٹوپی دنیا بھر سے جُدا تھی۔ نہ تُرکی، نہ تاتاری۔ کھال کو (خواہ وہ سمور ہو یا برہ) اس طرح سی لیا جاتا تھا کہ نیچے کا گھیر اُوپر کے چندوے سے ذرا بڑا رہے۔ اس کے بعد چار کنگرے قایم کرکے کھال کو ٹوپی کی آدھی لمبان تک اس طرح کاٹ لیا کہ ٹوپی گڑگج کی شکل بن گئی۔ بیچ میں چندوے کی جگہ مخمل یا گہرے رنگ کی بانات کنگروں کے کناروں سے ملا کر سی لی، اندر استر دے دیا۔ چلو مرزا نوشہ کی ٹوپی ہوگئی۔ شہر میں کلاہ تتری کا بہت استعمال ہے جس کو عام اصطلاح میں چوگوشیہ ٹوپی کہتے ہیں۔ یہ بھی کئی وضع کی ہوتی ہیں اور کئی طرح پہنی جاتی ہیں۔ جو ٹوپی شرفا استعمال کرتے ہیں اس کا دمہ (گوٹ) ذرا نیچا ہوتا ہے۔ دمے کے اُوپر چار پاکھے۔ پاکھے کی وضع بالکل شاہجہانی محراب کی سی ہوتی ہے۔ چاروں گوشوں کو اس طرح ملا کر سیتے ہیں کہ چاروں کونے کمرک (کمرخ) کے نمونے کے ہوجائیں۔ بعض لوگوں نے اس میں ذرا جدت بھی کی ہے، وہ یہ کہ دمے کو اونچا کرکے پاکھوں کی لمبان کو چوڑان سے کسی قدر بڑھا دیا ہے اور اُن کے سل جانے کے جو پہل پیدا ہوئے ہیں، ان کو پھر کاٹ کر کلیاں ڈال دی ہیں اس طرح بجائے چار پہل کے ٹوپی میں آٹھ پہل ہوگئے ہیں۔ خوبصورتی کے لیے دمے کے کناروں پر پتلی لیس اور گوشوں کے کناروں پر باریک قیطون لگاتے ہیں۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۰ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بادشاہ سلامت کی ٹوپی ہوتی تو اسی نمونے کی ہے مگر سلمے ستارے کے کام سے پٹی ہوئی اور جا بجا ہوتی اور نگینے لگے ہوئے اس قسم کی ٹوپی کئی طرح پہنی جاتی تھی۔ قلعہ والے تو پاکھوں کو کھڑا رکھتے ہیں باقی لوگ ان کو کسی قدر دبا لیتے ہیں۔ جو ٹوپی آٹھ بیہن کی ہوتی ہے اس کے پاکھوں کو تو اتنا دباتے ہیں کہ گوشے دمے کے باہر پھیل کر کنواں کی شکل بن جاتے ہیں۔ اس قسم کی ٹوپی ہمیشہ آڑی پہنی جاتی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ اس کا ایک کونہ بائیں بھوں کو دبائے۔ اس ٹوپی کے علاوہ ارخ چین (عرق چین) کی ٹوپی کا بھی بہت رواج ہے اس کا بنانا کچھ مشکل کام نہیں۔ ایک مستطیل کپڑے کے کناروں کو سر کی ناپ کی برابر سی لیا۔ نیچے پتلی سی گوٹ دے دی اور اوپر کے حصہ میں چنٹ دے کر چھوٹا سا گول گتہ لگا دیا۔ دہلی کی دو پلڑی ٹوپی اور لکھنؤ کی ٹوپی میں صرف یہ فرق ہے کہ یہاں یہ ٹوپی اتنی بڑی بناتے تھے کہ سر پر منڈھ جائے، برخلاف اس کے لکھنؤ کی ٹوپی صرف بالوں پر دہری رہتی ہے۔ ان ٹوپیوں کے علاوہ بعض بعض لوگ پنج گوشہ ٹوپی بھی پہنتے ہیں۔ اس ٹوپی میں پانچ گوشے ہوتے ہیں لیکن اس کی کاٹ چوگوشیہ ٹوپی سے ذرا مختلف ہے گوشوں کے اوپر کے حصے بس ایسے ہوتے ہیں جیسے فصیل کے کنگرے۔ نیچے دمے کی بجائے پتلی سی گوٹ ہوتی ہے۔ یہ ٹوپی قالب چڑھا کے پہنی جاتی ہے۔ قالب چڑھ کر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ہمایوں کے مقبرہ کا گنبد۔ عام لوگوں میں بڑے گول چندوے کی ٹوپی کا بھی بہت استعمال تھا۔ بعض تو بالکل سادی ہوتی ہیں اور بعض سوزنی کے کام یا قینچی کے کام کی۔ اس ٹوپی کو بھی قالب چڑھا کر پہنتے ہیں۔ لباس میں انگرکھا بہت پسند کیا جاتا ہے۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۱ پر)

کچھ لوگ تو وہیں جا رہے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ بنارس آتے جاتے رہتے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) دہلی کے انگرکھے کی چولی اتنی نیچی ہوتی ہے کہ ناف تک آتی ہے چونکہ ہر شخص کو کسرت کا شوق ہے اس لیے جسم کی خوبصورتی دکھانے کے لیے آستین بہت چست رکھتے ہیں اور بعض شوقین آستینوں کو آگے سے کاٹ کر اُلٹ لیتے ہیں۔ انگرکھے کے نیچے کرتا بہت کم لوگ پہنتے ہیں۔ قلعہ والوں کے انگرکھے کے اوپر جامہ وار یا مخمل کی خفتان ہوتی ہے۔ بہت تکلف کیا تو اس کے حاشیوں پر سیمور لگا لیا۔ نہیں تو عموماً گنگی لیس لگاتے ہیں، بٹنوں کی بجائے صرف ایک تکمہ اور گھنڈی ہوتی ہے۔ جس کو "عاشق ومعشوق یا چشمے"، کہتے ہیں۔ اس کی آستینیں ہمیشہ آدھی ہوتی ہیں۔ قلعے میں تو اس کو خفتان کہا جاتا ہے مگر شہر والے اس سینہ کھلے نیم آستین کو "شیروانی" کہتے ہیں انگرکھے کے اُوپر چوکور شالی رومال سموسہ کرکے پیٹھ پر ڈال لیتے ہیں۔ اس رومال کو عام اصطلاح میں "ارخ چین" (عرق چین) کہتے ہیں۔ کمر میں بھی بتی کرکے رومال لپیٹنے کا رواج ہے، مگر بہت کم۔ پیجامہ ہمیشہ قیمتی کپڑے کا ہوتا ہے، اکثر گلبدنی، غلطے، مشروع، موٹرے، اطلس یا گورنٹ کا ہوتا ہے۔ پُرانی وضع کے جو لوگ ہیں وہ تو اب بھی ایک بر ہی کا پائیجامہ پہنتے ہیں۔ مگر تنگ مہریوں کے پائیجامے بھی چل نکلے ہیں، سلیم شاہی جوتی کا استعمال شروع ہو گیا ہے، پھر بھی دہلی کے شرفا گھیتلی جوتی زیادہ پسند کرتے ہیں شاید ہی شہر بھر میں کوئی ہوگا جس کے ہاتھ میں بانس کی لکڑی اور گز بھر لٹھے کا چوکور رومال نہ ہو۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر بھی پور کا ٹھوس بھاری بانس لیتے، تیل پلاتے، مہندی مل کر باورچی خانہ میں لٹکاتے۔ یہاں تک کہ اس کی رنگت بدلتے بدلتے سیاہ ہو جاتی اور وزن تو ایسا ہو جاتا گویا سیسہ پلا دیا ہے۔ جو نکلتا ہے اینٹھتا ہوا نکلتا ہے۔ جس کو دیکھو چوڑا سینہ، پتلی کمر، پہنے ہوئے ڈنڈ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۲ پر)

ہیں۔ جو وہاں جا کر آتا ہے لباس میں نئی تراش خراش کرتا ہے۔ اس طرح اس کا لباس آدھا تیتر آدھا بٹیر ہو کر نہ لکھنؤ کا رہتا ہے نہ دہلی کا۔ اب جو لوگ یہاں بیٹھے ہیں اُنھی کو دیکھ لیجیے۔ جو شہزادے لکھنؤ جا کر آئے ہیں اُن کے سر پر دوپلڑی ٹوپی ہے، اونچی چولی کا انگرکھا ہے۔ نیچے باریک شربتی ململ کا کرتا اور تنگ پیجامہ ہے۔ جنھوں نے قلعہ کبھی نہیں چھوڑا اُن کے جسم پر وہی پُرانا لباس ہے۔ سر پر چوگوشیہ ٹوپی، جسم پر نیچی چولی کا انگرکھا، اس کے اوپر مخمل یا جامہ وار کی خفتان، پاؤں میں گلبدن یا قطنے کا ایک بر کا پیجامہ۔ جو لوگ لکھنؤ ہو آئے ہیں اُنھوں نے دہلی کے لباس کے ساتھ ڈاڑھی کو بھی خیرباد کہہ دیا ہے، چہرے کی ساخت سے اُن کو دہلی کا شہزادہ کہہ دو تو کہہ دو۔ مگر لباس اور وضع قطع سے تو یہ ٹھیٹھ لکھنؤ والے معلوم ہوتے ہیں۔

اُستاد ذوق سب سے مل ملا کر شمع میانے کے دائیں طرف بیٹھ گئے۔ مشاعرے میں شعرا کو سلسلے سے بٹھانا بھی ایک فن ہے۔ نواب زین العابدین خاں کی تعریف کروں گا کہ جس کو جہاں چاہا بٹھا دیا اور پھر اس طرح کہ کسی کو نہ کوئی شکوہ ہوا نہ شکایت۔ اگر کوئی ایسی جگہ بیٹھ جاتا جہاں اُن کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) شرفا میں تو شاید ڈھونڈھے سے ایک بھی نہ نکلے گا جس کو کسرت کا شوق نہ ہو۔ اور بانک، بنوٹ اور لکڑی نہ جانتا ہو۔ بچپن ہی سے ان فنون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مقابلے ہوتے ہیں واہ واہ سے بچوں اور نوجوانوں کا دل بڑھاتے ہیں اور فنون سپاہ گری کو شرافت کا تمغہ سمجھتے ہیں۔

خیال میں اس کو نہ بیٹھنا چاہیے تھا، تو بجائے اس کے کہ اس کو وہاں سے اُٹھاتے، خود ایسی جگہ جا بیٹھتے جہاں اُس کو بٹھانا چاہتے۔ تھوڑی دیر کے بعد کہتے "ارے بھئی۔ ذرا ایک بات تو سننا" وہ آ کر اُن کے پاس بیٹھ جاتا، اس سے باتیں کرتے رہتے، اتنے میں کوئی ایسا شخص آجاتا جس کو وہ خالی جگہ کے لیے موزوں سمجھتے "اُس سے کہتے تشریف رکھیے وہ جگہ خالی ہے"۔ جب وہ جگہ بھر جاتی تو کسی بہانے سے اُٹھ جاتے اور اسی طرح دو نشستوں کا انتظام ہو جاتا۔ شہزادوں کا سلسلے سے بٹھانا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر بگڑ کر اُٹھ جاتے ہیں کہ واہ ہم اور یہاں بیٹھیں۔ پھر لاکھ منائیے وہ بھلا کیا ماننے والے ہیں۔ ان جھگڑوں کو اُستاد ذوق خوب سمجھتے تھے۔ اس لیے اپنے ساتھ والوں کا انتظام اُنھوں نے خود کر لیا، مگر اس طرح کہ کسی کو یہ خیال بھی نہیں ہوا کہ یہ محفل کا بندوبست کر رہے ہیں۔ کسی سے کہتے صاحب عالم ادھر آئیے۔ کسی سے کسی خاص جگہ کی طرف اشارہ کرتے، کہتے بیٹھو بھئی بیٹھو۔ غرض تھوڑی دیر میں پوری مجلس جم گئی۔ نشست کا یہ انتظام تھا کہ میر مشاعرہ کے دائیں جانب وہ لوگ تھے جن کا تعلق قلعے سے تھا اور بائیں طرف شہر کے دوسرے اُستاد اور اُن کے شاگرد۔ ایک چیز جو مجھے عجیب معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ قلعے والے جتنے آئے تھے سب کے ہاتھوں میں بٹیریں دبی ہوئی تھیں۔ یہ بٹیر بازی اور مرغ بازی کا مرض قلعہ میں بہت ہے روزانہ تیتروں، بٹیروں اور مرغوں کی پالیاں ہوتی ہیں۔ ایک شہزادے صاحب نے تو یہ کمال کیا ہے ایک بڑے چھکڑے پر ٹھاٹھر لگا کر چھوٹا سا گھر بنا لیا ہے اور اُوپر چھت پر

مٹی ڈال کر کنگنی بودی ہے ٹھاٹھر میں خدا جھوٹ نہ بلائے تو لاکھوں ہی پڈریاں ہیں۔ جہاں چاہا چھکڑا لے گئے اور پدڑیاں اُڑا دیں۔ ایسی سدھی ہوئی ہیں کہ جھلّڑ سے ایک بھی پھٹ کر نہیں جاتی۔ اُنھوں نے جھنڈی ہلائی اور وہ اُڑیں، اُنھوں نے آواز دی اور وہ آ کر چھت پر بیٹھ گئیں۔

اُستاد ذوقؔ کو آئے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ مرزا فتح الملک ہوادار میں سوار آ پہنچے اُن کے ساتھ نواب مرزا خاں داغؔ تھے[1]۔ میاں داغ کی کوئی سولہ سترہ برس کی عمر ہو گی رنگت تو بہت کالی ہے مگر چہرے پر غضب کی نرماہٹ ہے۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں، ستواں ناک، کشادہ پیشانی، سر پر سیاہ مخمل کی لیس لگی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی۔ جسم میں ساسلیٹ کا انگرکھا سبز گلبدنی کا پیجامہ، ہاتھ میں ریشمی رومال، ہیں تو ابھی نوعمر مگر شعر ایسا کہتے ہیں کہ سبحان اللہ، شہر بھر میں ان کی غزلیں گائی جاتی ہیں۔ غرض ہوادار فرش سے ملا کر لگایا گیا۔ پہلے میاں داغؔ اُترے۔ اور اُتر کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ان کے بعد مرزا فتح الملک اُترے ان کا نیچے قدم رکھنا تھا کہ سب سرو قد کھڑے ہو گئے۔ چار چوبدار سبز کھڑکی دار پگڑیاں باندھے، نیچی نیچی سبز بانات کی چپکنیں پہنے۔ سُرخ قنالی رومال

---

[1] مرزا فخرو کے ساتھ نواب مرزا خاں داغؔ کے آنے کی یہ وجہ تھی کہ نواب شمس الدین خاں کے پھانسی پانے کے بعد ان کی بیوی یعنی داغؔ کی والدہ کا نکاح مرزا فخرو سے ہو گیا تھا اور اسی نسبت سے داغ قلعہ میں رہتے تھے (نواب فتح الملک کا عرف مرزا فخرو تھا)۔

کمر سے لپیٹے، ہاتھوں میں گنگا جمنی عصا اور مورچھل لیے ہوا دار کے پیچھے تھے۔ ادھر عصا بردار تو ان کے سامنے آ گئے اور مورچھل بردار پیچھے ہو لیے۔ اس سلسلے سے یہ جلوس آہستہ آہستہ شامیانے تک آیا مرزا فخرو نے شامیانے کے قریب کھڑے ہو کر سب کا سلام لیا۔ پھر چاروں طرف نظر ڈال کر کہا۔ "اجازت ہے۔" سب نے کہا "بسم اللہ۔ بسم اللہ۔" اجازت پا کر یہ شامیانے میں گئے اور سب کو سلام کر کے بیٹھ گئے۔ دوسرے سب لوگ بیٹھنے کی اجازت کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان سب کی طرف نظر ڈال کر کہا۔ "تشریف رکھیے۔ تشریف رکھیے۔" سب لوگ سلام کر کے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ اُستاد ذوق نے داغ کو اپنے قریب ہی ایک جگہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ وہاں جا بیٹھے۔ مورچھل بردار شامیانے کے پیچھے اور عصا بردار سامنے کی صف کی پشت پر جا کھڑے ہوئے۔ جب یہ انتظام ہو گیا تو نواب زین العابدین خاں آگے بڑھے۔ شامیانے کے پاس جا کر تسلیمات بجا لائے اور دو زانو ہو کر وہیں بیٹھ گئے۔ چپکے چپکے صاحب عالم سے کچھ باتیں کیں اور پھر اُٹھ کر اپنی جگہ جا بیٹھے۔ اُن کے اُٹھ کر چلے جانے کے بعد نواب فتح الملک نے دونوں ہاتھ فاتحہ[1] کو اُٹھائے۔ ساتھ ہی اہلِ مجلس نے ہاتھ اُٹھائے۔ فاتحہ خیر کے بعد صاحب عالم نے فرمایا۔ "اے خوشنوایانِ چمن دہلی! میری کیا بساط ہے جو آپ جیسے اُستادانِ فن

---

[1] نواب فتح الملک بڑے کٹے مسلمان تھے۔ کوئی کام بغیر فاتحہ خیر کے شروع نہ کرتے تھے اسی لیے سب قلعے والے ان کو "ملا" یا "ملیٹا" کہا کرتے تھے۔

کے ہوتے ہوئے میر مشاعرہ بننے کا خیال بھی دل میں لا سکوں۔ صرف حضرت پیر و مرشد کے فرمان کی تعمیل میں حاضر خدمت ہو گیا ہوں ورنہ کہاں میں اور کہاں ایسے بڑے مشاعرے کی میر مجلسی۔ محبو! اس مشاعرے کی ایک خصوصیت تو آپ کو معلوم ہے کہ اس کے لیے کوئی "طرح" نہیں دی گئی۔ اس کی دوسری خصوصیت آپ یہ پائیں گے کہ بجائے ایک شمع کے دو شمعیں گردش کریں گی۔ جس طرح "طرح" کے نکل جانے نے ایک دوسرے کے مقابلے میں فخر و مباہات کا دروازہ بند کر دیا ہے، اُسی طرح دو شمعوں کی وجہ سے پڑھنے میں تقدیم و تاخیر کے جو خیالات طبیعتوں کو مکدر کرتے تھے وہ بھی رفع ہو جائیں گے۔ مشاعرے کی ابتدا کرنے اور ختم کرنے کا خیال بھی اکثر دلوں میں فرق ڈالتا ہے۔ لیکن اس مشاعرے میں میں نے انتہا کو ابتدا کر دیا ہے۔ چنانچہ حضرت ظلِ سُبحانی کے کلام معجز سے مشاعرے کی ابتدا ہوگی۔ اور اس کے بعد ہی میں اپنی غزل عرض کر کے ابتدا اور انتہا کے فرق کو مٹا دوں گا۔" یہ کہہ کر مرزا فخرو نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ دونوں چوبدار جو سامنے کھڑے تھے دونوں شمعیں اُٹھا کر اُن کے سامنے لائے۔ اُنھوں نے بسم اللہ کہہ کر فانوس اُتارے اور شمعیں جلا کر فانوس چڑھا دیے۔ چوبداروں نے شمعیں لے جا کر لگنوں میں رکھ دیں اور سیدھے کھڑے ہو کر مرزا فخرو کی طرف دیکھا۔

گردن سے اشارہ پاتے ہی دونوں چوبداروں نے باآواز بلند کہا۔ "حضرات! مشاعرہ شروع ہوتا ہے۔"

اس آواز کا سُننا تھا کہ سناٹا سا ہو گیا۔ قلعے والوں نے بٹیریں

تھیلیوں میں بند کر تکیوں کے پیچھے رکھ دیں، نوکروں نے جھٹ پٹ حقّے سامنے سے ہٹا دیے اور ان کی جگہ سب کے سامنے اُگالدان، خاصدان اور بُن دھنیے کی تشتریاں رکھ اپنی اپنی جگہ جا کر کھڑے ہوئے۔ اتنے میں بارگاہ جہاں پناہی کا خواصی بادشاہ سلامت کی غزل لیے ہوئے قلعے سے آیا۔ اس کے ساتھ کئی نقیب تھے۔ وہ خود شمع کے قریب آ کر تسلیمات بجا لایا اور غزل پڑھنے کی اجازت چاہی۔ مرزا فخرو نے گردن کے اشارے سے اجازت دی۔ وہ وہیں بیٹھ گیا۔ نقیبوں نے آواز لگائی۔

"حاضرین! حضرت ظلِ سبحانی، صاحب قرآن ثانی خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ کا کلام معجز نظام پڑھا جاتا ہے۔ نہایت ادب کے ساتھ گوش دل سے سماعت فرمایا جائے۔"

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوشنوایانِ چمن کی آزمائش ہے

نقیب کی آواز کے ساتھ ہی سب اہل محفل دو زانو ہو سنبھل کر بیٹھ گئے اور پاس ادب سے سب نے گردنیں جھکا لیں۔ خواصی نے بادشاہ سلامت کی غزل خریطے میں سے نکالی، بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا اور بلند آواز سے سوز کے سُروں میں پڑھنا شروع کیا

الفاظ کی نشست، زبان کی خوبی، مضمون کی آمد اور سب سے زیادہ پڑھنے والے کے گلے نے ایک سماں باندھ دیا۔ ایک کیفیت تھی کہ زمین سے آسمان تک چھائی ہوئی تھی کسی کو تعریف کرنے کا بھی ہوش نہ تھا۔ اُستادانِ فن ہر شعر پر جھومتے تھے۔ کبھی کبھی کسی کے منہ سے سُبحان اللہ، سبحان اللہ کے الفاظ بہت نیچی آواز میں نکل گئے تو نکل گئے ورنہ ساری مجلس پر ایک عالمِ بیخودی طاری تھا۔ مقطع پر تو یہ حال ہوا جیسے کسی نے سب پر جادو کر دیا۔ ہر شخص وجد میں جھوم رہا تھا۔ باصرار تمام کئی کئی دفعہ مقطع پڑھوایا اور مضمون اور زبان کی چاشنی کا لُطف اُٹھایا۔ لیجیے آپ بھی پڑھیے اور زبان کے مزے لیجیے۔

نہیں عشق میں اس کا تو رنج ہمیں کہ قرار و شکیب ذرا نہ رہا
غمِ عشق تو اپنا رفیق رہا۔ کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر، رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

ہمیں ساغرِ بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہدِ نشاط یہ دورِ طرب، نہ رہیگا جہاں میں سدا نہ رہا

لگے یوں تو ہزاروں ہی تیرِ ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
دلے ناز و کرشمہ کی تیغ دودم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

ظفرؔ آدمی اُس کو نہ جانئیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی۔ جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

غزل پڑھ چکنے کے بعد خواص نے کاغذ مرزا فخرو کے ہاتھ میں دیا۔

زرافشاں کاغذ پر خود حضرت ظل اللہ کے قلم کی لکھی ہوئی غزل تھی۔ خط ایسا پاکیزہ تھا کہ آنکھوں میں کھبا جاتا تھا۔ مرزا فخرو نے کاغذ لے کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ مولوی مملوک العلی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "صاحب عالم! ہمارا کیا منہ ہے جو ہم حضرت ظل سبحانی کی غزل کی جیسی چاہیے ویسی تعریف کر سکیں، البتہ ان نوازشات شاہی کا شکر یہ ادا کرتے ہیں جو حضرت پیر و مرشد نے غزل بھیج کر شرکائے مشاعرہ پر مبذول فرمائی ہیں۔ بارگاہ جہاں پناہی میں ہمارا ناچیز شکریہ پیش کر کے ہماری عزت افزائی فرمائی جائے۔" مرزا فخرو نے خواص کی طرف دیکھا۔ اُس نے عرض کی "قبلۂ عالم! میں یہ پیام جاتے ہی پیشگاہِ عالی میں پہنچا دوں گا۔" خواص آداب کر کے جانے والا ہی تھا کہ مرزا فخرو نے روکا اور کہا "جانے سے پہلے صاحب عالم و عالمیان حضرت ولیعہد بہادر کی غزل بھی پڑھتے جاؤ۔ چلتے چلتے مجھے عنایت کی تھی اور فرمایا تھا کہ کسی خوش گلو شخص سے پڑھوانا۔ بھلا تم سے زیادہ موزوں اور کون شخص مل سکتا ہے۔" یہ کہہ کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ نکال کر خواصی کو دیا۔ اُس نے آداب کر کے کاغذ لیا اور وہیں بیٹھ کر یہ غزل سُنائی۔

دل سے لطف و مہربانی اور ہے	مہربانی کی نشانی اور ہے
قصۂ فرہاد و مجنوں اور ہے	عشق کی میرے کہانی اور ہے
روکنے سے کب مرے رکتے ہیں اشک	بلکہ ہوتی خوں فشانی اور ہے
ہم سے اے دارا وہ کب ملتے ہیں صاف	اُن کے دل میں بدگمانی اور ہے

غزل تو بہت پھیکی سی تھی۔ مگر ولیعہد بہادر کی غزل تھی، بھلا کس کا

جگرا تھا جو تعریف نہ کرتا۔ البتہ غالبؔ اور مومنؔ بالکل چپ بیٹھے رہے۔ بعض قلعے والوں کو بُرا بھی معلوم ہوا، مگر ان دونوں کو خوب سمجھتے تھے کہ یہ سچّی تعریف کرنے والے لوگ ہیں، ویسے تو ویسے اگر بادشاہ سلامت کی بھی کمزور غزل ہو تو گردن تک نہ ہلائیں۔ القصّہ خواصی تو غزل پڑھ رخصت ہوا اور اب حاضرینِ جلسہ کے پڑھنے کی نوبت آئی۔

مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا اس نے دونوں شمعیں لا، شامیانے کے سامنے رکھ دیں۔ صاحب عالم نے اپنی غزل نکالی اور اِدھر اُدھر نظر ڈال کر اور گردن کو ذرا جھکا کر کہا۔ "بھلا میری کیا مجال ہے کہ آپ جیسے کاملین فن کے مقابلے میں کچھ پڑھنے کا دعویٰ کروں، البتہ جو کچھ بُرا بھلا کہا ہے وہ بہ نظرِ اصلاح عرض کرتا ہوں۔"

غم وہ کیا ہے جو جاں گزا نہ ہوا ۔۔۔ درد وہ کیا جو لا دوا نہ ہوا
حال کُھل جائیں غیر کے سارے ۔۔۔ یہ کروں کیا کہ تو مرا نہ ہوا
درد کیا جس میں کچھ نہ ہو تاثیر ۔۔۔ بات کیا جس میں کچھ مزا نہ ہوا
وہ تو ملتا، پر اے دلِ کم ظرف ۔۔۔ تجھ کو ملنے کا حوصلہ نہ ہوا
شکوۂ یار اور نہ زبانِ رقیب ۔۔۔ کھیل ٹھیرا، کوئی گلہ نہ ہوا
تم رہو اور مجمعِ اغیار ۔۔۔ میرا کیا ہے، ہوا، ہوا نہ ہوا
پھر تمھارے ستم اُٹھانے کو ۔۔۔ رمزؔ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

مرزا فخرو کی آواز تو اونچی نہ تھی، مگر پڑھنے میں ایسا درد تھا کہ سُن کر دل بے قابو ہو جاتا تھا۔ سارا مشاعرہ واہ واہ اور

سبحان اللہ کے شور سے گونج رہا تھا۔ تیسرے شعر پر مرزا غالب نے اور پانچویں پر حکیم مومن خاں نے ایسے جوش سے واہ واہ کی کہ صف سے آگے نکل آئے۔ مرزا فخرو اپنی غزل پڑھتے رہے۔ مگر ان دونوں کو انھی دو شعروں کی رٹ رہی۔ پڑھتے اور مزے میں آکر جھومتے۔ جب غزل ختم ہوئی تو مرزا نوشہ نے کہا۔ "سبحان اللہ! صاحب عالم! سبحان اللہ۔ واہ کیا کہنا ہے شعر یوں کہتے ہیں، مزہ آگیا۔" اُستاد ذوق بھی مسکرائے کہ چلو اسی بہانہ سے میری تعریف ہو رہی ہے۔ مرزا فخرو نے اُٹھ کر سلام کیا اور کہا۔ "یہ آپ حضرات کی بزرگانہ شفقت ہے جو اس طرح ارشاد ہوتا ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔ وہ جدھر نظر ڈالتے لوگ تعریفیں کرتے اور وہ جھک جھک کر سلام کرتے۔ جب محفل میں ذرا سکون ہوا تو مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا اس نے شامیانے کے سامنے سے ایک شمع اُٹھا سامنے کی صف میں میاں یل کے آگے رکھ دی نام تو ان کا عبدالقادر تھا مگر شہر کا بچہ بچہ ان کو میاں یل کہتا تھا ان کو بھی اپنی طاقت پر اتنا غرور[1]

---

[1] اس غرور ہی نے آخر ان کو نیچا دکھایا۔ ان کا روز روز اکھاڑے میں آکر خم ٹھوکنا لوگوں کو ناگوار گزرا۔ شیخو والوں کے اُستاد حاجی علی جان نے ایک پٹھا تیار کیا بدن میں تو کچھ ایسا زیادہ نہ تھا۔ مگر داؤں پیچ میں طاق تھا اور پھرتی اس بلا کی تھی کہ کیا کہوں ایک دن جو میاں یل نے حسب معمول شیخو والوں کے ہاں آکر خم ٹھونکے تو لونڈا کپڑے اُتار بیٹرا بدل سامنے آگیا اور خم ٹھونک کر ہاتھ ملانا چاہا۔ میاں یل کو ہنسی آگئی کہ بھلا یہ پودنا میرا کیا مقابلہ کریگا۔ ہاتھ ملانے میں تامل کیا۔ اُستاد (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۲ پر)

تھا کہ کسی پہلوان کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ جس اکھاڑے میں جاتے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) علی جان نے کہا۔ "کیوں بھئی ہاتھ کیوں نہیں ملاتے۔ یا تو ہاتھ ملاؤ یا پھر کبھی اس اکھاڑے میں آکر خم نہ ٹھونکنا۔" کہنے لگے "استاد! جوڑ تو دیکھو خوامخواہ اس لونڈے کو پسوانے سے حاصل؟" استاد نے کہا "میاں جو جیسی کرے گا ویسی بھریگا۔ دنگل میں تم اسے کچل ڈالنا۔ یہی ہوگا۔ کہ ہڈی پسلی تڑوا کر آیندہ کو کان ہو جائینگے۔" بہرحال دونوں کے ہاتھ مل گئے اور تاریخ مقرر ہوگئی اس مشاعرے کے دو چار ہی دن بعد شاہی دنگل میں کشتی قرار پائی عیدگاہ کے پاس ہی دنگل ہے۔ دس پندرہ ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ مگر اس روز وہاں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی جدھر نظر جاتی سر ہی سر دکھائی دیتے۔ میاں بل کی ہمدردیوں کی وجہ سے ساری دہلی اس لونڈے کی طرف تھی۔ پہلے چھوٹی موٹی کشتیاں ہوتی رہیں۔ ٹھیک چار بجے یہ دونوں جانگیے پہن چادریں پھینک دنگل میں اترے۔ اترتے ہی دونوں نے "یا علی" کا نعرہ مارا دو چار ڈھیکلیاں کھائیں۔ کچھ مٹی پڑھ کر سینے پر ڈالی اور خم ٹھونک آمنے سامنے آگئے دونوں کے جسموں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ہاتھی اور چیونٹی کا مقابلہ تھا۔ تمام دنگل میں سناٹا تھا۔ سوئی بھی گرے تو آواز سن لو۔ ہاں آواز تھی تو یا علی کی یا خم ٹھونکنے کی۔ میاں بل نے لونڈے کا ہاتھ پکڑ جھٹکا دیا وہ آگے کو جھکا یہ کمر پر آگئے وہ چٹ غوطہ مار ہاتھوں کو چیر نکل گیا۔ انھوں نے اس کا سیدھا ہاتھ پکڑ دھوبی پاٹ پر کسنا چاہا، وہ توڑ کر کے الگ جا کھڑا ہوا۔ یہ گاؤ زوری کر کے اس کو دبا تو لیتے لیکن وہ اپنی پھرتی کی وجہ سے ذرا سی دیر میں صاف نکل جاتا۔ آخر ایک دفعہ یہ اس کو دبا ہی بیٹھے وہ چپکا پڑا رہا انھوں نے ہفتے کس لیے تھوڑی دیر تک اس کو خوب رگڑا وہ سہے چلا گیا۔ انھوں نے پہلو میں آکر اس کا (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۳ پر)

وہاں خم ٹھونک آتے اور کسی کو جواب میں اُن کے سامنے خم ٹھونکنے کی ہمت نہ ہوتی، پہلوانی کی نسبت تخلص پل رکھا تھا۔ مضمون بھی رندانہ باندھتے تھے۔ پڑھتے اس طرح تھے کہ گویا میدان کارزار میں رجز پڑھ رہے ہیں۔ اس سے غرض نہ تھی کہ کوئی تعریف کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ ان کو اپنے شعر پڑھنے سے کام تھا غزل لکھی تھی :-

کہہ دو رقیب سے کہ وہ باز آئے جنگ سے ہرگز نہیں ہیں یار بھی کم اُس دبنگ سے

لب کا بڑھا دیا ہے مزا خطِ سبز نے ساقی نے پشت دی مئے صافی کو بنگ سے

دل اُسکے بے طرح ہے پھنسا زلفِ یار میں نکلے یہ کیونکہ دیکھیے قیدِ فرنگ سے

آ جائیو نہ پیچ میں ظالم کے دیکھنا یاری تو تم نے کی ہے پل اُس شوخ و شنگ سے

ان کی غزل ختم ہوتے ہی چوبدار نے دوسری شمع اُٹھا مرزا علی بیگ کے سامنے رکھ دی یہ بڑے گورے چٹے نوجوان آدمی ہیں۔ کسرت کا بھی شوق ہے۔ نازنین تخلص کرتے ہیں۔ دہلی میں بس یہی ایک ریختی گو ہیں۔ ادھر شمع رکھی گئی اُدھر نواب زین العابدین خاں نے آواز دی اُوڑھنی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سینہ کھولنا چاہا وہ بھی موقع تاک رہا تھا۔ یہ کھینچنے میں ذرا غافل ہوئے اُس نے ٹانگ پر باندھ جو اڑایا تو میاں پل چاروں خانے چت جا پڑے، لونڈا اُچک سینہ پر سوار ہوگیا۔ وہ مارا، وہ مارا کی آوازوں سے دنگل ہل گیا لوگوں نے دوڑ لونڈے کو گود میں اُٹھا لیا۔ کسی نے یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ میاں پل کہاں پڑے ہیں، یہ بھی چپکے سے اُٹھ چادر اُوڑھ مُنہ لپیٹ ایسے غائب ہوئے کہ پھر کسی نے ان کی صورت نہ دیکھی دنگل سے کیا سگئے ہمیشہ کے لیے دہلی سے گئے، تھے بڑے غیرتمند، وہ دن اور آج کا دن پھر ان کی صورت نظر نہ آئی خدا جانے کہاں مر کھپ گئے۔

لاؤ۔" ایک نوکر فوراً گہرے سُرخ رنگ کی تاروں بھری اوڑھنی لے کر حاضر ہوا۔ نازنین نے لے، بڑے ناز و انداز سے اس کو اوڑھا۔ ایک پلّو کا بکل مارا، دوسرا پلّو سامنے پھیلا لیا اور خاصی بھلی چنگی عورت معلوم ہونے لگے۔ غزل ایسی لٹرکڑ کر اور اَڑ اَڑ کر پڑھی کہ سارا مشاعرہ عش عش کرنے لگا۔ نرت ایسا پیارا کیا کہ کوئی بیسوا بھی کیا کرے گی۔ دوسرا شعر تو اس طرح پڑھا کہ گویا "باجی" کو جلانے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ قلعے والوں کو تو اس غزل میں بڑا مزا آیا۔ مگر جو ریختے کے اُستاد تھے وہ خاموش بیٹھے سنتے رہے۔ غزل یہ تھی۔

ہوئی عشاق میں مشہور یوسف سا جواں تنّا کا ہوا ہم عورتوں میں تھا بڑا دیدہ زلیخا کا
مجھے کہتی ہیں باجی تو نے تنّا کا چھڑے دیو کو نہیں ڈرنے کی میں بھی ہاں نہیں تنّا کا تو ابّا کا
اگر اے نازنیں تو دُبلی پتلی کانسی سی ہے چھریرا سا بدن نام خدا ہے تیرے دولھا کا

اب دونوں شمعیں اس طرح گردش کرنے لگیں کہ پہلے صف کے سیدھی جانب کا ایک شخص غزل پڑھتا تھا اور پھر اُلٹی طرف کا۔ نازنین کے پڑھنے کے بعد دائیں جانب کی شمع ہٹ کر میاں عاشق کے سامنے آئی۔ یہ بیچارے ایک مزدور پیشہ آدمی ہیں۔ لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے نہ کسی کے شاگرد ہیں نہ کسی کے اُستاد۔ شعر خاصہ اچھا کہتے ہیں اس مشاعرہ میں ایک شعر تو ایسا نکل گیا ہے کہ سُبحان اللہ، لکھا ہے۔

فقط تو ہی نہ میرا لے بتِ خونخوار دشمن ہے
ترے کوچے میں اپنا ہر در و دیوار دشمن ہے

غزل میں باقی سارے اشعار تو صرف بھرتی کے تھے مگر اس

شعر پہ ہر طرف سے بڑی دیر تک واہ واہ ہوتی رہی۔ ان کے غزل ختم کرنے پر بائیں طرف کی شمع اُٹھا کر عبداللہ خاں اَوج کے سامنے رکھ دی گئی۔ یہ بڑے پرانے ۴۰، ۵۰ برس کے مشاق شاعر ہیں۔ مضمون کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں رہتے ہیں لیکن ڈھونڈھ ڈھانڈ کر ایسے بلند مضامین اور نازک خیالات لاتے ہیں کہ ایک شعر تو کیا ایک قطعے میں بھی اُن کی سمائی مشکل ہے اور کوشش یہ کرتے ہیں کہ ایک ہی شعر میں مضمون کو کھپا دیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ بھلا دوسروں کو تو ان کے شعروں میں کیا مزا آئے اور کوئی کیا داد دے ہاں یہ خود ہی پڑھتے ہیں اور خود ہی مزے لیتے ہیں اور خود ہی اپنی تعریف کر لیتے ہیں۔ غزل اس زور شور سے پڑھتے ہیں کہ زور میں آ کر صف مجلس سے گزوں آگے نکل جاتے ہیں۔ ان کے شاگرد تو دو چار ہی ہیں مگر اُستاد بھی ان کو اُستاد مانتے ہیں۔ بھلا کس کا آج بل بوتا ہے جو ان کو اُستاد نہ کہہ کر مفت کی لڑائی مول لے۔ اِدھر انھوں نے شعر پڑھا اُدھر اُستاد ذوق یا مرزا غالب نے داد دی۔ داد دینے میں ذرا دیر ہوئی اور ان کے تیور بدلے۔ ان کے غصّہ کی بھلا کون تاب لا سکتا ہے چار و ناچار تعریف کرنی پڑتی جب کہیں جا کر یہ ٹھنڈے پڑتے۔ غزل ہوتی تھی:

دم کا جو دمدمہ یہ، باندھے خیال اپنا — بے پُل صراط اُتریں، یہ ہے کمال اپنا
طفلی ہی سے ہے مجھ کو وحشت سے ہر گز نفرت — شم میں گڑا ہوا ہے، آہو کے نال اپنا
کسبِ شہادت اپنا ہے یاد کس کو قاتل — سانچے میں تیغ کے سر لیتے ہیں ڈھال اپنا
چیچک کے آبلوں کی ہیں باگ پڑتا ہو جب — دیوی کے آستاں پہ میں بیٹھال اپنا

آخری شعر پر تو مرزا غالب اچھل پڑے۔ کہنے لگے "واہ میاں اوج، اس شعر کے دوسرے مصرع نے تو غضب ڈھا دیا ہے۔ بھئی یہ اللہ الفاظ "رکھ کے" کیا خوب پھنسائے ہیں۔ یہ سب کا فر ہیں جو تمھیں اُستاد کہتے ہیں۔ میاں تم شعر کے خدا ہو خدا" غرض سب اُستادوں نے تعریفوں کے پل باندھ دیے اور میاں اوج ہیں کہ پھول کر کپّا ہوئے جاتے ہیں۔ جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی طرف کی شمع کھسک کر محمد یوسف تمکین کے سامنے آئی ان کی عمر ۱۵، ۱۶ سال کی ہوگی۔ مدرسہ دہلی میں طالب علم ہیں۔ غضب کی ظریفانہ طبیعت پائی ہے۔ بات کرنے میں مُنہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ نازک نقشہ سانولا رنگ، بھرے بھرے ہاتھ پاؤں جوان ہوں گے تو بڑے خوبصورت آدمی نکلیں گے۔ یہ غزل کہی تھی۔

کس دل جلے کی یارِ خدایا یہ آہ تھی ... دوزخ بھی جس سے مانگتا ہر دم پناہ تھا

آئین کونسا تھا یہ کیا رسم و راہ تھی ... خانہ خراب ہو جیو تیرا عشق بے حیا ق

رہتا خدا تھا جس میں یہ وہ بارگاہ تھی ... تو نے جو دل کو میرے صنم خانہ کر دیا

جادو فریب آہ یہ کس کی نگاہ تھی ... تمکین کو اک نگاہ میں دیوانہ کر دیا

میاں تمکین کا دل بڑھانے کو سب نے تعریف کی، قطعہ کو کئی کئی دفعہ پڑھوایا، اُستاد احسان نے کہا "میاں یوسف! کیا کہنا ہے، خوب کہتے ہو۔ کوشش کیے جاؤ ایک نہ ایک دن اُستاد ہو جاؤ گے۔ مگر میاں کسی کے شاگرد ہو جاؤ۔ بے اُستاد کے رہے تو بھٹک نکلو گے" میاں تمکین نے مسکرا کر کہا۔ "اُستاد! میں کہیں آپ کے حکم سے باہر ہو سکتا ہوں کل ہی انشاء اللہ اُستاد اوج کی خدمت میں حاضر ہو جاتا

ہوں۔" اُستاد ذوق نے کہا "ہاں بھئی ہاں۔ خوب انتخاب کیا۔ بس یہ سمجھ لو کہ چند ہی دن میں بیڑا پار ہے۔" یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دوسری شمع غلام احمد تصویر کے سامنے پہنچ گئی۔ ان کو میاں بن بھی کہتے ہیں۔ الف کے نام بے نہیں جانتے۔ مگر طبیعت غضب کی پائی ہے۔ پہلے میاں تنویر کے شاگرد تھے بعد میں اُن سے ٹوٹ کر اُستاد ذوق سے آ ملے۔ بھاری بدن، منڈی ہوئی ڈاڑھی، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، گہرا سانولا رنگ جسم پر سوسی کا تنگ مہری کا پیجامہ اور سوسی ہی کا کرتہ۔ کندھے پر لٹھے کا رومال، سر پر سوزنی کے کام کی گول ٹوپی بیچارے بیچہ بندی پر گذر اوقات کرتے ہیں، بڑے پُرگو شاعر ہیں، لکھنا پڑھنا تو جانتے ہی نہیں اس لیے جو کچھ کہتے ہیں دل و دماغ میں ٹھو نستے جاتے ہیں۔ یاد اس بلا کی ہے کہ ذرا چھیڑ دو تو ارگن کی طرح بجنے لگتے ہیں اور ختم کرنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ کلام ایسا پاکیزہ ہے کہ بڑے بڑے اُستادوں کے سر ہل جاتے ہیں، ان کو سنو تو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ایک اُمّی پڑھ رہا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ الشعراء تلامیذ الرحمٰن کی بہترین مثال ہیں، غزل کہی تھی۔

ہجر کی شب تو سحر ہو یا رب	وہ نہ آیا تو قیامت ہی سہی
جان بیکار تو اپنی نہ گئی	اے ستمگر تری شہرت ہی سہی
تجھ سے اتنا بھی نہ کھنچیے صاحب	آپ پر میری طبیعت ہی سہی
جذبۂ دل نہیں لایا تم کو	آپ کی خیر عنایت ہی سہی

ہر شعر پر واہ، واہ اور سبحان اللہ کے شور سے محفل گونج جاتی تھی۔ غزل تمام ہوئی تو اُستاد ذوق نے حکیم مومن خاں کی

طرف دیکھ کر کہا: "خاں صاحب۔ یہ میاں بتن بھی غضب کی طبیعت لے کر آئے ہیں۔ کہنے کو تو میرے شاگرد ہیں مگر اب تک ان کے کسی شعر میں اصلاح دینے کی مجھے تو ضرورت نہیں ہوتی۔ کل ایک غزل سنائی تھی، میں تو پھڑک گیا ایک شعر تو ایسا بے ساختہ نکل گیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ ہاں میاں بتن وہ کیا شعر تھا۔ میاں بتن نے ذرا دماغ پر زور ڈالا اور شعر دماغ سے پھسل زبان پر آ گیا۔ مطلع تھا۔

پہنچی تری نگاہ کی پہلو میں آ لگی ۔۔۔ پہلو سے دل میں، دل سے کلیجہ میں جا لگی

اور شعر یہ تھا

دامن پہ وہ سکھے نہ رکھے دلربا لگی ۔۔۔ لیکن ہماری خاک ٹھکانے سے آ لگی

حکیم صاحب نے بہت تعریف کی اور کہا۔ "میاں بتن! یہ خدا کی دین ہے یہ بات پڑھنے پڑھانے سے پیدا نہیں ہوتی۔ میاں خوش رہو، اس وقت دل خوش کر دیا۔"

ان کے بعد شمع محمد جعفر تابش کے سامنے آئی۔ یہ الہ آباد کے رہنے والے ہیں، بہت دنوں سے دلی میں آ رہے ہیں۔ بیچارے گوشہ نشین آدمی ہیں۔ شاعری سے دلی لگاؤ ہے۔ کوئی مشاعرہ نہیں ہوتا جہاں نہ پہنچتے ہوں۔ غزل میں دو شعر بہت اچھے تھے وہی لکھتا ہوں۔

کبھی بن بادہ رہ نہیں سکتے ۔۔۔ توبہ کچھ ہم کو سازگار نہیں

دل میں خوش ہیں عدو پڑے تابش ۔۔۔ وہ ستمگر کسی کا یار نہیں

مقطع کی کچھ ایسی پیاری بندش پڑی ہے کہ سب کے منہ سے بے ساختہ واہ واہ نکلی مفتی صدر الدین صاحب کی تو یہ حالت

تھی کہ پڑھتے تھے اور جھومتے تھے۔

تابش کے بعد اُلٹی جانب کی شمع میاں قلق کے آگے گئی۔ خدا ان سے محفوظ رکھے، بڑے چالاک آدمی ہیں۔ عبدالعلی نام ہے۔ مدراس کے رہنے والے ہیں، کوئی ۳۰ برس کی عمر ہے۔ بچپن ہی میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ حیدرآباد ہوتے ہوئے دہلی آئے۔ ہزاروں کو تعویذوں کے جال میں پھنسا کر پٹرا کر دیا۔ ان کی شکل سے لوگ گھبراتے ہیں۔ شاہ صاحب بنے پھرتے ہیں۔ مگر دل کا خدا مالک ہے۔ شعر خاصہ کہتے ہیں۔ لکھا تھا۔

ساقی بنا دے ماہ پیالہ اوچھال کے　　خم شراب سے خم گردوں تو بن گیا
جھگڑے وہاں نہیں ہیں حرام و حلال کے　　ہم مشربوں میں چل کے قلق میکشی کرد

یہ پڑھ چکے تو شمع[1] منشی محمود جان اوج کے سامنے گئی۔ اُن کی غزل میں دو ہی شعر ایسے تھے جن کی تھوڑی بہت تعریف ہوئی، باقی کے تو سب بھرتی کے تھے۔

کچھ مقدر کا ہمارے پھیر ہے　　آنے میں اُس جانِ جاں کے دیر ہے
موت کے آنے میں پھر کیوں دیر ہے　　ہے یقیں وہ جانِ جاں آتا نہیں

اُن کے بعد مرزا کامل بیگ کی باری آئی، یہ سپاہی پیشہ آدمی ہیں کامل تخلص کرتے ہیں مشاعرے میں بھی وہی سپاہیانہ رنگ جھلک رہا ہے، ان کی غزل میں قطعہ بڑے مزے کا تھا وہی لکھتا ہوں۔

---

[1] آیندہ یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ سیدھی طرف کی شمع بڑھی یا اُلٹی جانب سے بس یہ سمجھ لیجیے کہ پہلے دائیں طرف کا ایک شاعر پڑھتا تھا اور پھر بائیں طرف کا۔

مژگاں سے گر بچے دل، ابرو کرے ہے ٹکڑے ق یہ بات میں نے کہہ کر جب اس سے داد چاہی
کہنے لگا کہ ترکشِ حسن وقت ہوئے خالی تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی

اب حکیم سید محمد تعشق کے پڑھنے کا نمبر آیا۔ یہ بڑے پایہ کے ادیب ہیں ۶۳، ۶۴ برس کی عمر ہے حکمت میں اپنا جواب نہیں رکھتے غرض کیا کہوں ایک جامع کمالات شخص ہیں۔ مگر اپنے آپ کو بہت دور کھینچتے ہیں۔ اچھا شعر سنتے ہیں تو بیتاب ہو جاتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ جس طرح میں تعریف کرتا ہوں، اس طرح دوسرے بھی میرے شعر کی تعریف کریں۔ شعر برا نہیں کہتے۔ مگر ایسا بھی نہیں ہوتا کہ مشاعرہ چمک اُٹھے اور ہر شخص کے مُنہ سے بے ساختہ واہ واہ نکل جائے۔ آپ خود ہی اُن کا کلام دیکھ لیجیے۔

تجھ کو اس میری آہ وزاری پر رحم اے فتنہ گر نہیں آتا
وعدۂ شام تو کیا لیکن کچھ وہ آتا نظر نہیں آتا
تیرے بیمار کا ہے یہ عالم ہوش دو دو پہر نہیں آتا

تعریف تو ہوئی۔ مگر کچھ ان کے دل کو نہ لگی اس لیے ذرا آزردہ سے ہو گئے۔

ان کے بعد شمع میر حسین تجلی کے سامنے آئی۔ یہ میر تقی میر کے پوتے ہیں، بڑے ظریف اور نکتہ سنج آدمی ہیں۔ کلام میں وہی میر صاحب کا رنگ جھلکتا ہے۔ زبان پر جان دیتے ہیں۔ غزل تو چھوٹی سی ہوتی ہے مگر جو کچھ کہتے ہیں اچھا کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو آخر کس کے پوتے ہیں۔

مری وفا پہ تجھے روز شک تھا اے ظالم یہ سر یہ تیغ ہے لے اب تو اعتبار آیا

یہ شوق دیکھو پس مرگ بھی تجلّی نے کفن میں کھول دیں آنکھیں، سُنا جو یار آیا

میاں تجلّی پڑھ چکے تو حکیم سکھا نند رقم کی باری آئی۔ ان کو میں حکیم مومن خاں صاحب کے مکان پر دیکھ چکا تھا۔ کلام تو ایسا اچھا نہیں ہوتا۔ مگر پڑھتے خوب ہیں، یہاں کسی نے ذرا بھی تعریف کی اُنھوں نے سلام کا تار باندھ دیا۔ غزل لکھی تھی۔

بُجھانا آتش دل کا بھی کچھ حقیقت ہے ذرا سا کام تجھے چشم تر نہیں آتا

عدم سے کوچۂ قاتل کی راہ ملحق ہے گیا اُدھر جو گزر پھر ادھر نہیں آتا

ہو خاک چارہ گری اس مریض کی تیرے نظر میں تجھ سا کوئی چارہ گر نہیں آتا

تیسرا شعر حکیم مومن خاں صاحب کے رنگ کا تھا اس کی اُنھوں نے بہت تعریف کی مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا۔ "میاں رقم! یا تو تم حکمت ہی کر دیا شعر ہی کہو۔ ان دونوں چیزوں کا ملا کر چلانا ذرا مشکل کام ہے۔"

شمع کا شیخ نیاز احمد جوش کے سامنے جانا تھا کہ شاگردانِ ذوق ذرا سنبھل بیٹھے۔ جوش کو اُستاد ذوق بہت عزیز رکھتے ہیں ان کی عمر تو ۱۸، ۱۹ سال کی ہے مگر بلا کے طبّاع اور ذہین ہیں۔ ان کی سخن گوئی اور سخن فہمی کی قلعے بھر میں دھوم ہے۔ مگر مشاعرے میں اُنھوں نے جو غزل پڑھی وہ مجھے کچھ پسند نہ آئی۔ ہاں قلعے والوں نے واہ واہ کے شور سے مکان سر پر اُٹھا لیا۔ اُستاد ذوق نے بھی "سبحان اللہ سبحان اللہ" کہہ کہہ کر شاگرد کا دل بڑھایا۔ غزل دیکھ لیجیے ممکن ہے کہ میں نے ہی غلط اندازہ لگایا ہو۔

کیونکر وہ ہاتھ آئے کہ یاں زور و زر نہیں لے دے کے ہے اک آہ سو اُس میں اثر نہیں

قسمت سے درد بھی تو ہوا وہ ہمیں نصیب جس درد کا کہ چارہ نہیں، چارہ گر نہیں

قسمت ہی میں نہیں ہے شہادت مگر یہاں ‏ ‏ ‏ وہ زخم کونسا ہے کہ جو کارگر نہیں
سجدے میں یاں کیوں پڑا ہے ارے اٹھ شرابی ‏ ‏ ‏ اے جوش میکدہ ہے خدا کا یہ گھر نہیں

آپ نے غزل ملاحظہ کر لی۔ میں تو اب بھی یہی کہوں گا کہ کوئی شعر بھی ایسا نہیں ہے جو تعریف کے قابل ہو۔ اسے زبردستی کی تعریفیں کہنا دوسری بات ہے۔

ان کے بعد مولوی امام بخش صہبائی کے بڑے فرزند محمد عبد العزیز کا نمبر آیا۔ یہ عزیز تخلص کرتے ہیں۔ غزل خوب کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو بڑے باپ کے بیٹے ہیں، ہائے کیا کیا شعر نکالے ہیں، لکھتے ہیں۔

جوں شمع شغل تیرے سراپا نیاز کا ‏ ‏ ‏ جلنا جو سوز کا ہے تو رونا گداز کا
کج فہمیوں سے خلق کی دیکھا کہ کیا ہوا ‏ ‏ ‏ منصور کو حریف نہ ہونا تھا راز کا
ہم عاصیوں کا بار گنہ سے جھکا ہے سر ‏ ‏ ‏ اور خلق کو گمان ہے ہم پر نماز کا
مغرور تھا ہی اور وہ مغرور ہو گیا ‏ ‏ ‏ اس میں گلہ نہیں مجھے آئینہ ساز کا
اوروں کے ساتھ لطف سے تھا صورت نیاز ‏ ‏ ‏ یاں بڑھ گیا دماغ تغافل سے ناز کا

ذرا سچ کہیے گا، ساری کی ساری غزل مرصع ہے یا نہیں۔ ہاں اس غزل کی جو کچھ تعریف ہوئی وہ بجا ہوئی۔ اُستاد ذوق نے بھی کہا۔ "بھئی صہبائی تمھارا یہ لڑکا غضب کا نکلا ہے۔ خدا اس کی عمر میں برکت دے ایک دن بڑا نام پیدا کرے گا۔ واہ میاں صاحبزادے واہ کیا کہنا ہے! دل خوش ہو گیا۔ کیوں نہ ہو ایسوں کے ایسے ہی ہوتے ہیں۔" میاں عزیز نے اُٹھ کر سلام کیا اور بیٹھ گئے۔

میاں عزیز کے بعد شمع خواجہ معین الدین یکتا کے سامنے آئی۔ اُن کا کیا کہنا سرکار سے خطاب خانی پایا ہے۔ کسی کو خاطر میں ہی

نہیں لاتے۔ کبھی کسی کے شاگرد ہوتے ہیں کبھی کسی کے۔ پہلے احسان سے تلمذ تھا آج کل مرزا غالب کی طرف ڈھلک گئے ہیں۔ ایسے متلون مزاجوں کو نہ کبھی کچھ کہنا آیا ہے نہ آئے گا۔ میرا بڑا دل خوش ہوا کہ کسی نے تعریف نہیں کی۔ بڑے چلے ہوں گے بھلا ایسے شعروں کی کوئی خاک تعریف کرے۔

اے آہ شعلہ زا یہ خس و خار بھی نہیں — نو آسماں ہیں دو بھی نہیں چار بھی نہیں
ہے کس کو تاب شکوۂ دشمن کہ ضعف سے — لب پر ہمارے تذکرۂ یار بھی نہیں
جینا فراق یار میں وعدہ کی لاگ پر — آسان گر نہیں ہے تو دشوار بھی نہیں

ہاں اب جس کے سامنے شمع آئی ہے وہ شاعر ہے۔ یہ کون ہیں۔ مرزا حاجی بیگ شہرت۔ گورا رنگ، میانہ قد، کوئی ۳۰، ۳۲ برس کی عمر، بڑے بنے سنور سے رہتے ہیں۔ پہلے انھی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ اب تھوڑے دنوں سے بند ہے۔ مفتی صدر الدین صاحب کے شاگرد رشید ہیں۔ کہتے بھی خوب ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں بڑی پاٹ دار آواز ہے۔ پڑھنے کا ڈھنگ ایسا ہے کہ ایک ایک لفظ دل میں اُترتا جاتا ہے، ہر شعر پر تعریفیں ہوئیں اور کیوں نہ ہوتیں ہر شعر تعریف کے قابل تھا۔ غزل یہ ہے۔

ایک دن دو دن کہاں تک تو بھی کچھ انصاف کر — یہ تو جلنا روز کا اے سوزِ ہجراں ہو گیا
ہے ترقی جوہر قابل ہی کے شایاں کہ بنا — خاک کا پتلا بنا پتلے سے انساں ہو گیا
کفر و دیں میں تھا نہ کچھ عقدہ بجز بند نقاب — اس کے کھلتے ہی یہ کارِ مشکل آساں ہو گیا
پہلے دعوائے خدائی اس بت کا فر کو تھا — کچھ درستی پہ جو آج آیا تو انساں ہو گیا

آخری شعر پر مرزا غالب کی یہ حالت تھی کہ گویا بالکل مست ہو گئے

ہیں، رانوں پر ہاتھ مارتے اور کہتے۔ "واہ میاں شہرت واہ! کمال کر دیا۔ شعر کیا ہے اعجاز ہے، یہ ایک شعر بڑے بڑے دیوانوں پر بھاری ہے۔ ہاں کیا کہا ہے، سبحان اللہ! پہلے دعوائے خدائی اس بت کافر کو تھا۔ کچھ درستی پر جو آج آیا تو انساں ہو گیا!" غرض اس شعر نے ایک عجیب کیفیت محفل میں پیدا کر دی تھی۔ لوگ خود پڑھتے۔ ایک دوسرے کو سناتے، مزے لے لے کر جھومتے اور جوش میں واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے مارتے۔ بڑی دیر میں جا کر محفل میں ذرا سکون ہوا تو شمع نوازش حسین خاں تنویر کے سامنے گئی۔ یہ نوجوان آدمی ہیں کوئی ۳۲، ۳۳ برس کے ہونگے۔ بادشاہ سلامت ان کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ میاں شہرت کے شعر نے وہ جوش پیدا کر دیا تھا کہ ان کی غزل کسی نے بھی غور سے نہیں سنی۔ غزل بھی معمولی تھی صرف یہ قطعہ خاصہ تھا۔

جان کر دل میں مجھے اپنا مریض تپ غم تو کہتا لوگوں سے بظاہر بت عیار ہے کیا
رنگ رخ زرد ہے، تر چشم ہے، لب پر دم سرد پوچھنا اس سے کہ اس شخص کو آزار ہے کیا

یہ پڑھ چکے تو شمع میر بہادر علی حزیں کے سامنے رکھی گئی۔ یہ بڑے سنجیدہ، متین اور وضعدار آدمی ہیں، عارف کے شاگرد ہیں ان کا ایک شعر بڑے مزے کا ہے۔

سبو سے منہ لگائیں گے اب اتنا صبر ہے کس کو
کہ بھر لیے خم سے مے شیشے میں اور شیشے سے ساغر میں

جو غزل انھوں نے اس روز مشاعرے میں پڑھی تھی اس کے یہ دو تین شعر اچھے تھے۔

دنیا کی وسعتیں ترے گوشے میں آگئیں ۔۔۔ اللہ ری وسعتیں تری، اے تنگنائے دل
جل جل کے آخرش تپشِ غم کے ہاتھ سے ۔۔۔ اک داغ رہ گیا مرے پہلو میں جائے دل
دیکھا وہ اپنی آنکھ سے جو کچھ سُنا نہ تھا ۔۔۔ اور دیکھیے حزیں ابھی کیا کیا دکھائے دل

مقطع کو سب نے پسند کیا اور واقعی ہے بھی اچھا۔

اس کے بعد شمع ایسے شخص کے سامنے آئی جو خود شاعر، جس کا باپ شاعر، جس کا بھائی شاعر جس کا سارا خاندان شاعر، وہ کون؟ میاں باقر علی جعفری، فخر الشعراء نظام الدین ممنونؔ کے چھوٹے بھائی، ملک الشعراء قمر الدین منتؔ کے چھوٹے بیٹے، ان کی غزل میں زور نہ ہوگا تو اور کس کی غزل میں ہوگا۔ غزل تھی۔

تیغ یوں دل میں خیال نگہِ یار نہ کھینچ ۔۔۔ تا خدا ترس تو کعبہ میں تو تلوار نہ کھینچ
بے سر و پا چمن و دشت میں عالم کے نہ پھر ۔۔۔ نازِ ہر گُل نہ اُٹھا منتِ ہر خار نہ کھینچ

غزل کی جیسی چاہیے ویسی تعریف نہیں ہوئی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ رنگ اب دہلی سے اُٹھتا جاتا ہے۔ اب تو روزمرّہ پر لوگ جان دیتے ہیں۔ اس میں اگر مضمون پیدا ہوگیا تو سُبحان اللہ۔ مرزا غالبؔ اس رنگ کے بڑے دلدادہ تھے۔ وہ بھی اس کو اب چھوڑتے جارہے ہیں۔

اس کے بعد منشی محمد علی تشنہؔ کے پڑھنے کی باری تھی۔ چوبدار ان کے سامنے شمع رکھنے میں ذرا ہچکچایا یہ ننگ دھڑنگ مزے میں دوزانو بیٹھے جھوم رہے تھے۔ چوبدار نے مرزا فخرو کی طرف دیکھا انھوں نے آنکھ سے اشارہ کیا کہ "رکھ دے"۔ اُس نے شمع رکھ دی۔ جب شمع کی روشنی آنکھوں پر پڑی تو میاں تشنہ نے بھی آنکھیں کھولیں۔ کچھ سمجھ کر پھونک مار شمع گل کر دی اور کہا "میں تھا، کچھ عرض کروں؟" سب نے

کہا "ضرور فرمائیے۔" انھوں نے نہایت آزادانہ لہجے میں کچھ گاتے ہوئے کچھ پڑھتے ہوئے یہ غزل سنائی۔

آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے
سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں

شمع ہے گل بھی ہے بلبل بھی ہے پروانہ بھی
رات کی رات یہ سب کچھ ہے سحر کچھ بھی نہیں

حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے
فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں

نیستی کی ہے مجھے کوچۂ ہستی میں تلاش
سیر کرتا ہوں ادھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں

ایک آنسو بھی اثر جب نہ کرے اے تشنہ
فائدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

میں کیا بتاؤں کہ اس غزل کا کیا اثر ہوا۔ ایک سناٹا تھا کہ زمین سے آسمان تک چھایا ہوا تھا۔ غزل کا مضمون، آدھی رات کی کیفیت، پڑھنے والے کی حالت۔ غرض یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری محفل کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ ادھر یہ عالم طاری تھا، ادھر میاں تشنہ ہاتھ جھٹکتے ہوئے اور "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کہتے ہوئے اٹھے اور اسی عالم بیخودی میں دروازے سے باہر نکل گئے۔ ان کی "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کی آواز بڑی دیر تک کانوں میں گونجتی رہی۔ ذرا طبیعتیں سنبھلیں تو سب کے منہ سے بے اختیار یہی نکلا کہ "واقعی کچھ بھی نہیں۔"

مرزا فخرو نے شمع منگا کر روشن کی اور کہا "ہاں صاحب پھر شروع کیجیے۔" شمع حافظ محمد حسین بسمل کے سامنے رکھی گئی بھلا تشنہ کے بعد ان کا کیا رنگ جمتا۔ اول تو یہ نومشق ہیں مرزا قادر بخش صابر سے اصلاح لیتے ہیں، دوسرے غزل میں بھی کوئی خاص بات نہ تھی۔ البتہ مقطع اچھا تھا۔ غزل ملاحظہ ہو۔

دل تو نے ہم سے او بت کافر اٹھا لیا
اس نازکی پہ بوجھ یہ کیونکر اٹھا لیا

بارِ گرانِ عشق فلک سے نہ اُٹھ سکا کیا جانے میرے دل نے یہ کیونکر اُٹھا لیا
پیرِ مغاں نے تنگ مسکش کو دیکھ کر شیشہ بغل میں ہاتھ میں ساغر اُٹھا لیا

بہرحال کسی نے سُنا کسی نے نہ سُنا، کچھ تھوڑی بہت تعریف بھی ہوئی اور شمع میر حسین تسکین کے پاس پہنچ گئی۔ اُن کی عمر کوئی ۴۰ برس کی ہوگی۔ صہبائی کے شاگرد ہیں، مومن سے بھی اصلاح لی ہے ان کا خاندان دہلی میں بہت مشہور ہے۔ انھی کے دادا میر حیدر نے میر حسین علی وزیر فرخ سیر کو مارا تھا۔ سپاہی پیشہ آدمی ہیں۔ شعر بھی بُرا نہیں کہتے۔ لکھا تھا۔

ہزار طرح سے کرنی پڑی تسلیٔ دل کسی کے جانے سے گو خود نہیں قرار مجھے
شبِ وصال میں سُننا پڑا فسانۂ غیر سمجھتے کاش وہ اپنا نہ رازدار مجھے
وہ اپنے وعدے پہ محشر میں جلوہ فرمائیں نہیں ہے ضعف سے اتنوہ میں گذار مجھے
مرے قصور سے دیدار میں ہوئی تاخیر نہ دیکھنا تھا تماشائے روزگار مجھے
مزے یہ دیکھے ہیں آغازِ عشق میں تسکیں کہ سوجھتا نہیں اپنا مآلِ کار مجھے

غرض اس غزل نے مشاعرے کا رنگ پھر درست کر دیا اور لوگ ذرا سنبھل کر ہو بیٹھے اُستاد احسان کے شاگرد خواجہ غلام حسین بیدل کے سامنے شمع آئی اُنھوں نے یہ غزل پڑھی۔

نگہ کی، چشم کی، زلفِ دوتا کی سہے اک دل جفا کس کس بلا کی
کب اُس گل کی گلی تک جا سکے ہے ہوا باندھی ہے یاروں نے ہوا کی
بتوں سے ملتے ہو راتوں کو بیدل تمھیں بھی دن لگے قدرت خدا کی

ساری کی ساری ہی غزل پھسپھسی تھی، بھلا اس کی کون تعریف کرتا۔ ہاں اس کے بعد جو غزل محمد حسین صاحب تائب نے پڑھی اس میں مزا آ گیا۔ میاں تائب مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے

بھتیجے ہیں اور فخر الشعراء نظام الدین ممنون کے شاگرد۔ چھوٹی بحر میں ایسی غزل لکھتے ہیں کہ سبحان اللہ اور پڑھنا تو ایسا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ غزل تھی۔

پھر کتاں وار جگر چاک ہوا ۔۔۔ پھر کوئی ماہ لقا یاد آیا
کہیے اُس بت کو مشابہ کس کے ۔۔۔ دیکھ کر جس کو خدا یاد آیا
عہد پیری میں جوانی کی اُمنگ ۔۔۔ آہ کس وقت میں کیا یاد آیا

دوسرے اور تیسرے شعر پر تو یہ حال تھا کہ لوگ تعریفیں کرتے کرتے اور میاں ثاقب سلام کرتے کرتے تھکے جاتے تھے جب ذرا جوش کم ہوا تو شمع اُستاد ذوق کے اُستاد غلام رسول شوق کے سامنے آئی۔ بیچارے بڈھے آدمی ہیں، شاہ نصیر کے شاگرد ہیں۔ مسجد عزیز آبادی میں امامت کرتے ہیں۔ شروع شروع میں اُستاد ذوق نے ان کو اپنا کلام دکھایا تھا۔ اسی برتے پر یہ اپنے آپ کو ان کا اُستاد کہا کرتے ہیں۔ اور اب بھی چاہتے ہیں کہ ذوق اُسی طرح آکر مجھ سے اصلاح لیا کریں۔ مجھے تو کچھ سٹھیائے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں۔ غزل جو پڑھی تو واقعی اُس کا مطلع بڑے زور کا تھا۔ باقی اللہ اللہ خیر سلا۔

لکھا ہوا ہے یہ اس مہ جبیں کے پردے پر
نہیں ہے کوئی اب ایسا زمیں کے پردے پر

اُستاد ذوق کے چھیڑنے کو غالب، مومن، آزردہ اور صہبائی۔ غرض جتنے استادانِ فن تھے سب نے میاں شوق کی بڑی واہ واہ کی اور اُنھوں نے اُستاد ذوق کی طرف دیکھ کر کہا۔ "دیکھا شعر یوں کہتے

ہیں" وہ بیچارے ہنس کر خاموش ہوئے، اُن کے ایک آدھ شاگرد نے جواب دینا بھی چاہا۔ مگر اُنھوں نے روک دیا۔

خدا خدا کرکے اُن سے فراغت ہوئی تو شمع آزاد کے سامنے آئی۔ ان کا نام الگزنڈر ہیڈلے ہے۔ قوم کے فرانسیسی ہیں، دلی میں پیدا ہوئے۔ یہیں تربیت پائی اور یہیں سے توپ خانے کے کپتان ہوکر الور گئے۔ کوئی ۲۱ سال کی عمر ہے۔ ڈاکٹری بھی جانتے ہیں۔ شعر و سخن کا بہت شوق ہے۔ ظفر کے شاگرد ہیں۔ جہاں مشاعرے کی خبر سُنی اور دہلی میں آموجود ہوئے۔ لباس تو وہی فوجی ہے۔ مگر بات چیت اُردو میں کرتے ہیں۔ ایسی صاف اُردو بولتے ہیں جیسے کوئی دہلی والا بول رہا ہے۔ شعر بھی کچھ بُرے نہیں ہوتے۔ ایک فرانسیسی کا اُردو میں ایسے شعر کہنا واقعی کمال ہے۔ غزل ملاحظہ ہو۔

وہ گرمِ رہِ راہِ معاصی ہوں جہاں تک | گرمی سے رہا نام نہ دامن میں تری کا
کچھ پاؤں میں طاقت ہو تو کر دشت نوردی | ہاتھوں سے مزا دیکھ ذرا جیب دری کا
جہلم کو عیادت کے لیے وہ گئے تھے | آزاد ٹھکانا بھی ہے اس بے خبری کا

آزاد کے بعد شمع دوسری طرف میر شجاعت علی تسلّی کے پاس آئی۔ بیچارے غریب صورت فرسودہ لباس کوئی ۵۴، ۵۵ برس کے آدمی ہیں۔ شاہ نصیر کے بڑے چاہتے شاگردوں میں تھے۔ اپنے زمانے کے جرأت سمجھے جاتے تھے۔ اب بہت دنوں سے دنیا سے کنارہ کشی کرکے قدم شریف میں جا رہے ہیں۔ مشاعرے کی کشش کبھی کبھی اُن کو دہلی کھینچ لاتی ہے۔ پڑھنے کا انداز بھی نرالا ہے، اس طرح پڑھتے ہیں جیسے کوئی باتیں کرتا ہو۔ غزل شروع کرتے ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ عاشق د

معشوق میں سوال جواب ہو رہے ہیں۔

کیسی ٹھوکر جڑی ہے حضرتِ دل ۔۔۔ پاؤں پر اس کے سر دھرو تو سہی
جب کہا میں نے تم پہ مرتا ہوں ۔۔۔ ق ۔۔۔ تم گلے سے مرے لگو تو سہی
بولے وہ کیا مزے کی باتیں ہیں ۔۔۔ خیر ہے کچھ، پرے ہٹو تو سہی
غیر کے مل وہ لگ کے چھاتی سے ۔۔۔ ق ۔۔۔ مجھ سے کہنے لگے، سنو تو سہی
اس لیے اُس کے ہم گلے سے لگے ۔۔۔ کہ ذرا جی میں تم جلو تو سہی

اس غزل کی جیسی تعریف ہونی چاہیے تھی ویسی نہیں ہوئی، کیونکہ اب وہ وقت آگیا تھا کہ نیند کے خمار سے سر میں چکر آنے لگے تھے اور بُرے بھلے کی تمیز دشوار ہوگئی تھی، اس کے بعد جو ایک دو غزلیں ہوئیں وہ بس ہوگئیں نہ کسی نے شوق سے سُنا اور نہ مزہ آیا۔

میاں تسلی کے بعد شورؔ نے غزل پڑھی۔ یہ کوئل کے رہنے والے ہیں۔ قوم کے عیسائی ہیں اور نام جارج پیش ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ کس کے شاگرد ہیں۔ ہاں اکثر دہلی آتے جاتے رہتے ہیں جو کچھ کہہ لیتے ہیں بہت غنیمت ہے۔ غزل

عاجز تھا اپنی جان سے ایسا ترا مریض ۔۔۔ دیکھے سے جس کے حالتِ عیسیٰ تباہ تھی
دل سے یہ بیخودی کہ خودی سے بھلا دیا ۔۔۔ ورنہ یہ زیست مرگ کی اپنے گواہ تھی
دیر و حرم میں تو نہ دے ترجیح زاہدا ۔۔۔ جس سمت سر جھکا وہی تیری سجدہ گاہ تھی

اس کے بعد محمد عسکری نالاںؔ کی باری آئی بھلا اس تو سے برس سے بڈھے کی آواز نیند کے خمار میں کسی کو کیا سُنائی دیتی۔ مصحفی کے سب سے پہلے شاگرد ہیں۔ اب تو ان کو بس تبرک سمجھ لو۔ شعر بھی وہی باوا آدم کے وقت کے کہتے ہیں۔

سحر کے ہونے کا دل کو خیال رہتا ہے　　شبِ وصال بھی دل کو ملال رہتا ہے
وہ بدگمان ہوں کہ اُس بت کے سایہ پر بھی مجھے　　رقیب کا ہی سدا احتمال رہتا ہے

میاں نالاںؔ نے پڑھنا ختم ہی کیا تھا کہ شمع میر صاحب کے سامنے پہنچ گئی۔ شمع کا رکھنا تھا کہ ہر شخص سنبھل کر بیٹھ گیا۔ بعض نے انگلیوں سے آنکھیں مل ڈالیں۔ بعض نے کرتے کے دامن سے رگڑ یں، بعض اٹھ اور پانی کا چھپکا منہ پر مار، آ بیٹھے کیسی نیند اور کہاں کا سونا۔ میر صاحب کے نام نے سب کو چاق چوبند کر دیا۔ مرزا فخرو اب تک ایک پہلو پر بیٹھے تھے، اُنھوں نے بھی پہلو بدلا۔ اُستادانِ فن کے چہروں پر مُسکراہٹ آئی۔ نوجوانوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ میر صاحب بھی صف سے کچھ آگے نکل آئے۔ مرزا فخرو نے کہا "میر صاحب یہ ٹھیک نہیں۔ آپ تو بیچ میں آکر پڑھیے" یہ کہہ کر چوبدار کو اشارہ کیا اُس نے دونوں شمعیں اُٹھا وسط صحن میں رکھ دیں۔ میر صاحب بھی اپنی جگہ سے اُٹھ، شامیانے کے عین سامنے آ بیٹھے۔ بھلا دہلی میں کون ہے جو میر صاحب کو نہیں جانتا۔ کونسا مشاعرہ ہے جو ان کی وجہ سے چمک نہیں اُٹھتا۔ کونسی محفل ہے جہاں ان کے قدم کی برکت سے رونق نہیں آجاتی۔ ان کا نام تو شاید گنتی کے چند آدمی جانتے ہوں، ہم نے تو جب سُنا ان کا نام میر صاحب ہی سُنا۔ کوئی ۷۰ برس کی عمر ہے بڑے سوکھے سہے آدمی ہیں۔ غلافی آنکھیں، طوطے کی چونچ جیسی ناک، بڑا دہانہ، لمبی داڑھی، بیٹا سا، سر، خشخاشی بال، گوری رنگت، اونچا قد۔ غرض ان کے حلیے کو دہلی کے کسی بچے سے بھی پوچھیے تو پورے کا پورا بتا دے۔ نہایت صاف ستھرا لباس۔ سُفید ایک

برکا پجامہ، سفید کرتا، اس پر سفید انگرکھا، سر پر ارخچین (عرف چین) ٹوپی، چہرے پر متانت بلا کی تھی۔ مگر جب غصہ آتا تو کسی کے سنبھالے نہ سنبھلتے تھے۔ چھوٹا ہو یا بڑا۔ کوئی ان سے بغیر مذاق کے بات نہیں کرتا تھا۔ اور یہ بھی تڑسے وہ جواب دیتے تھے کہ منہ پھر جائے۔ اس سے اُن کو غرض نہ تھی کہ جواب ہو بھی گیا یا نہیں۔ مشاعرے میں میاں تمکین سے لے کر بادشاہ سلامت تک ان کو چھیڑتے تھے، انھوں نے نہ اِن کا بُرا مانا نہ اُن کا۔ جواب دینے میں نہ ان سے رُکے نہ اُن سے۔ غزل ہمیشہ فی البدیہ پڑھتے تھے۔ لکھ کر لانے کی کبھی تکلیف گوارا نہیں کی۔ غزل میں مصرعوں کے توازن کی ضرورت ہی نہ تھی، صرف قافیہ اور ردیف سے کام تھا جو کچھ کہنا ہوا نہایت اطمینان سے نثر میں بیان کرنا شروع کیا۔ بیچ میں دوسروں کے اعتراضوں کا جواب بھی دیتے رہے۔ جب کہتے کہتے تھک گئے تو ردیف اور قافیہ لا شعر کو ختم کر دیا۔ اُنھوں نے شعر پڑھنا شروع کیا اور چاروں طرف سے اعتراضوں کی بوچھار ہو گئی۔ یہ بھلا کب دبنے والے آسامی ہیں چوکھا لڑتے، جب زبان سے نہ دبا سکتے تو زور میں آکر کھڑے ہو جاتے۔ یہ کھڑے ہوئے اور کسی نے ان کو بٹھا دیا، معترض کو ڈانٹا۔ میر صاحب کا دل بڑھایا اور پھر وہی اعتراضوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور تو اور مولوی مملوک العلی صاحب کو ان سے اُلجھنے میں مزا آتا تھا۔ یہ بھی مولوی صاحب کی وہ خبر لیتے تھے کہ اگر ان کا کوئی شاگرد سُن لیتا تو مدرسہ سے مولوی صاحب کا سارا رعب داب رخصت ہو جاتا۔

میر صاحب نے شمع کے سامنے بیٹھتے ہی ساری محفل پر ایک نظر ڈالی اور کہا "حضرات! میں آج میاں ہدہد کی شان میں ایک قصیدہ سناؤں گا۔ اپنے منہ میاں مٹھو، یہ اپنی تعریف خود تو بہت کچھ کر چکے ہیں اب ذرا دل لگا کر اپنی ہجو بھی سن لیں۔"

میاں ہدہد سے سب چلے بیٹھے تھے، اب جو سنا کہ ان کی ہجو ہو رہی ہے اور پھر وہ بھی میر صاحب کے منہ سے سب نے کہا "ہاں میر صاحب ضرور فرمائیے۔" میاں ہدہد حکیم آغا جان عیش کے پٹھو تھے اور انھی کے بل پر پھدکتے تھے، اب جو حکیم صاحب نے سنا کہ میر صاحب ہدہد کی ہجو پر اتر آئے ہیں تو بہت پریشان ہوئے۔ ڈر تھا کہ کہیں مجھ کو بھی نہ لپیٹ لیں، دوسرا کوئی ہجو کرے تو جواب بھی دیا جائے بھلا میر صاحب کی بحر طویل کا کون جواب دے سکتا ہے اور تو کچھ بن نہ پڑا میاں ہدہد کو گاؤ تکیہ کے پیچھے غائب کر دیا۔ اب جو میر صاحب ادھر نظر ڈالتے ہیں تو ہدہد ندارد ہیں۔ بہت گھبرائے ادھر دیکھا ادھر دیکھا جب کسی طرف نظر نہ آئے تو کہا "ہجو ملتوی کر کے اب میں غزل پڑھتا ہوں۔" سب نے کہا۔ "ہیں! میر صاحب، یہ آپ نے ارادہ کیوں تبدیل فرما دیا۔ پڑھیے

لہ غدر کے بہت بعد میر صاحب کا انتقال ہوا ہے۔ میاں کالے صاحب کے فرزند میاں نظام الدین صاحب کے مکان پر جو مشاعرہ ہوتا تھا اس میں بھی یہ شریک ہوتے تھے اس مشاعرہ کے دیکھنے والے اب بھی دہلی میں بہت موجود ہیں۔ انھی لوگوں کی زبانی میر صاحب کے حالات معلوم ہوئے اور درج کیے گئے [illegible]

میر صاحب! خدا کے لیے پڑھیے۔ سودا کے بعد ہجو تو اُردو زبان سے اُٹھ ہی گئی۔ اگر آپ بھی اس طرف توجہ نہ کریں گے تو غضب ہو جائیگا۔ زبان ادھوری رہ جائے گی۔" میر صاحب نے کہا "نا بھئی۔ نا۔ میاں ہد ہد ہوتے تو جو کچھ ہم کو کہنا تھا ان کے مُنہ پر کہتے۔ ان کے پیٹھ پیچھے ان کو کچھ کہنا ہجو نہیں غیبت ہے، اور میں غیبت کرنے والوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔" جب میر صاحب کا یہ رنگ دیکھا تو حکیم آغا جان کے دم میں دم آیا۔ اُنھوں نے بھی اس ہجو اور غیبت کے فرق کے متعلق چند مناسب الفاظ کہے اور خدا خدا کر کے یہ آئی بلا ٹلی۔

اب میر صاحب نے غزل شروع کی۔ کیا پڑھا، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ بس اتنا تو معلوم ہوا کہ "تیر، ہیر، کھیر" قافیہ اور "دے ہے" ردیف ہے۔ اس کے علاوہ میں تو کیا خود میر صاحب بھی نہیں بتا سکتے کہ اُنھوں نے کیا پڑھا اور مضمون کیا تھا۔ جہاں قافیہ اور ردیف آئے وہاں لوگوں نے سمجھ لیا کہ شعر پورا ہوگیا۔ اور تعریفیں شروع ہوئیں کسی نے ایک آدھ اعتراض بھی جڑ دیا۔ اعتراض ہوا اور میر صاحب بگڑے۔ ان کے بگڑنے میں سب کو مزا آتا تھا۔ اعتراضوں اور میر صاحب کے جوابوں کا رنگ بھی دیکھ لیجیے۔ غزل میں میر صاحب نے جو ایک مصرعہ کو کھینچنا شروع کیا تو اتنا کھینچا اتنا کھینچا کہ شیطان کی آنت ہوگیا۔ مولوی مملوک العلی صاحب نے کہا۔ "اجی میر صاحب! یہ مصرعہ بحرِ طویل میں جا پڑا۔" میر صاحب نے کہا۔ مولوی صاحب

ٹھونک دیا۔ پہلے مطوّل[1] پڑھیے۔ مطول۔ جب معلوم ہوگا بحرِ طویل کس کو کہتے ہیں۔ مولوی صاحب بڑے چکرائے کہنے لگے "میر صاحب بھلا مطول کو بحرِ طویل سے کیا واسطہ۔ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ آپ کا جو جی چاہتا ہے کہہ جاتے ہیں۔" میر صاحب کو اب کسی حمایتی کی تلاش ہوئی۔ مولانا صہبائی کی طرف دیکھا اُنھوں نے کہا۔ "مولوی صاحب! مطول میں بحرِ طویل کی بحریں نہیں ہیں تو اور کیا ہے۔ آپ بھی ہمارے میر صاحب کو اپنی علمیت کے دباؤ سے خاموش کر دینا چاہتے ہیں۔" بس اتنی مدد ملنی تھی کہ میر صاحب شیر ہو گئے۔ کہنے لگے "جی ہاں! مولوی صاحب آپ سمجھتے ہوں گے کہ آپ کے سوا کسی نے مطول پڑھی ہی نہیں۔ اجی حضرت میں تو روزانہ اس کے دو دور کرتا ہوں کل ہی اس کی ایک بحر میں غزل لکھنے بیٹھا تھا۔ لکھتے لکھتے تھک گیا ایک مصرع کوئی پونے دو سو صفحوں میں لکھا۔ وہ تو کہو کہ بیاض کے صفحے ہی ختم ہو گئے جو مصرع ختم ہوا، ورنہ خدا معلوم اور کہاں تک جاتا۔" مرزا نوشہ نے کہا۔ "میر صاحب آپ سچ فرماتے ہیں۔ ہمارے مولوی صاحب نے بحرِ طویل کہاں دیکھی۔ مجھ سے پوچھو۔ میرے بھتیجے خواجہ امان کو جانتے ہو۔ اُس نے ایک کتاب بوستانِ خیال لکھی ہے یہ یہ بڑی اور یہ یہ موٹی بارہ جلدیں ہیں بحرِ طویل کے بس بارہ مصرعوں میں ساری جلدیں ختم ہو گئی ہیں آپ کا مصرع بحرِ طویل

---

[1] علم معانی اور بلاغت پر علامہ تفتازانی کی ایک مشہور تصنیف کا نام مطول ہے۔

ہیں نہیں رباعی کی بحر میں ہے۔" میر صاحب نے بڑے زور سے "ہیں" کی اور کہا "واہ۔ مرزا صاحب۔ سیدھے چلتے چلتے آپ بھی بھٹک گئے۔ رباعی کی بحریں آپ کو معلوم بھی ہیں۔ بھلا بتائیے تو سہی۔ کونسی کتاب میں ہیں۔" یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا۔ مرزا غالب ذرا چپ ہوئے تو خود میر صاحب نے کہا "میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ آپ نے زبردستی اعتراض کر دیا ہے۔ مرزا صاحب! اربعین[1] پڑھیے جب معلوم ہوگا کہ رباعی کی بحریں کون کونسی ہیں۔"

غرض اسی طرح کی خوش مذاقی میں کوئی گھنٹہ بھر گزر گیا۔ ہنستے ہنستے جو آنسو نکلے اُنھوں نے نیند کے خمار سے آنکھیں صاف کر دیں اور ایسا معلوم ہونے لگا گویا مشاعرے کا دوسرا دور شروع ہو رہا ہے اور سب لوگ تازہ دم ابھی آکر بیٹھے ہیں۔ جب لوگ اعتراض کرتے کرتے اور میر صاحب جواب دیتے دیتے تھک گئے تو ایک دفعہ ہی میر صاحب نے فرمایا "حضرات! غزل ختم ہوئی۔" سب نے کہا "میر صاحب! ابھی مقطع تو آیا ہی نہیں۔ بے مقطع کی یہ کیسی غزل؟" میر صاحب نے فرمایا "مقطع کی اُس شاعر کو ضرورت ہے جو بتانا چاہے یہ غزل میری ہے۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں، ہماری غزل کی یہی پہچان ہے۔ جہاں شروع کی بس معلوم ہو گیا کہ یہ میر صاحب کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔" یہ کہتے کہتے اُنھوں نے جزدان گردانا

---

[1] اربعین فی اصول الدین حضرت امام غزالی (رح) کی ایک مشہور تصنیف ہے جس کو میر صاحب نے رباعیوں کی بحروں سے متعلق کر دیا۔

اور اپنی جگہ آ بیٹھے۔ ایک شمع اُٹھا کر میر صاحب کے عین مقابل کے شاعر مرزا جمعیت شاہ ماہر کے سامنے رکھ دی گئی۔ یہ شاہ عالم بادشاہ غازی انار اللہ برہانہ کے پوتے اور صابر کے شاگرد ہیں۔ کلام صاف اور زبان بڑی میٹھی ہے۔ لکھا تھا۔

ہم بھی ضرور کعبہ کو چلتے پر اب تو شیخ ــــــ قسمت سے تکدے ہی میں دیرا رہ گیا
ناصح کی بات سننے کا کس کو یہاں دماغ ــــــ تیرا ہی ذکر تھا کہ میں ناچار رہ گیا
اے ہمنشیں وہ حضرت ماہر نہ ہوں کہیں ــــــ اک پارسا سُنا ہے کہ میخوار رہ گیا

میر صاحب کے کلام نے سب کی آنکھوں سے نیند کا خمار اُتار دیا تھا اس لیے غزل کی جیسی چاہیے ویسی تعریف ہوئی اور میاں ماہر کو محنت کا پورا پورا صلہ مل گیا۔

ان کے بعد شمع قاضی نجم الدین برق کے سامنے آئی۔ یہ سکندر آباد کے رہنے والے ہیں۔ کوئی ۲۰، ۲۲ برس کی عمر ہے۔ سر پر لمبے لمبے بال، سانولی رنگت اس میں سبزی جھلکتی ہوئی، اونچا قد، وجیہ صورت، سفید غرارہ دار پیجامہ، سفید انگرکھا، دو پلڑی ٹوپی، بڑے خوش مزاج، شیریں کلام، ہنس مکھ، بذلہ سنج، وارستہ مزاج، رند مشرب آدمی ہیں۔ پہلے مومن خاں کے شاگرد تھے پھر ان کے ایما سے میاں تسکین کو کلام دکھانے لگے۔ آواز بڑی دلکش اور طرز ادا خوب ہے۔ غزل بھی ایسی پڑھی کہ واہ واہ! کہتے ہیں۔

بزم اغیار ہے ڈر ہے نہ خفا تو ہو جائے ــــــ ورنہ ایک آہ میں کھینچوں تو ابھی ہو، ہو جائے
حرم و دیر کے جھگڑے ترے چھپنے سے پڑے ــــــ ورنہ تو پردہ اُٹھا دے تو تو ہی تو ہو جائے
کچھ مزا ہے یہ ترے روٹھ کے من جانے کا ــــــ چاہتا ہوں یونہی ہر روز خفا تو ہو جائے

تو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بندۂ پاک　　میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے
آپ انکار کریں وصل سے میں درگزرا　　کچھ تو ہو جس سے طبیعت مری یکسو ہو جائے
ہو نہ ہو بس میں کوئی، کچھ نہیں بس کی بات　　دل بیتاب پہ اے برق جو قابو ہو جائے

اللہ، اللہ! در و دیوار سے بیخودی برس رہی تھی جب یہ مصرع پڑھا کہ "میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے" تو ساری محفل پر ایک مستی سی چھا گئی۔ اور تو اور اُستادانِ فن کی بھی یہ حالت تھی کہ بار بار شعر پڑھواتے، خود پڑھتے اور مزے لیتے تھے۔

ابھی ان کی تعریفیں ختم نہ ہوئی تھیں کہ شمع مرزا منجھلے المتخلص بہ فسوں کے سامنے رکھی گئی یہ نوجوان آدمی ہیں۔ مرزا کرم بخش مرحوم کے فرزند اور حضرت ظلِ سبحانی کے نواسے ہیں۔ ان کا کیا کہنا زبان تو ان گھر کی لونڈی ہے۔ گا کر غزل پڑھتے ہیں، پڑھتے کیا ہیں۔ جادو کرتے ہیں۔ ان کی غزل کے دو شعر لکھتا ہوں۔

اللہ رے جذبۂ دل مضطر کہ تیر کا　　باہر ہمارے پہلو کے سوفار رہتی ہیں
کچھ آپ ہی آپ دل یہ مرا بیٹھا جائے ہے　　ظاہر میں نوالی میں بہار رہتی ہیں

دوسرے شعر میں الفاظ کیا بٹھائے ہیں۔ نگینے جڑ دیے ہیں۔ آخر کیوں نہ ہو قلعہ کے رہنے والے ہیں۔

ان کے بعد سیدھی جانب سے شمع سرک کر لالہ بالمکند حضور کے سامنے آئی یہ ذات کے کھتری اور خواجہ میر درد کے شاگرد ہیں کوئی ۷۰، ۸۰ برس کا سن ہے۔ سفید نورانی چہرہ، اس پر سفید لباس۔ بغل میں انگوچھ، کندھوں پر سفید کشمیری رومال۔ بس جی چاہتا تھا کہ ان کو دیکھے ہی جائیے۔ شمع سامنے آئی تو انھوں نے عذر کیا کہ

میں اب سنانے کے قابل نہیں رہا۔ سننے کے قابل رہ گیا ہوں۔" جب سبھوں نے اصرار کیا تو انھوں نے یہ قطعہ پڑھا۔

نہ پاؤں میں جنبش نہ ہاتھوں میں طاقت جو اُٹھ کھینچیں دامن ہم اس دلربا کا
سرِ راہ بیٹھے ہیں اور یہ صدا ہے کہ اللہ والی ہے بے دست و پا کا

قطعہ اس طرح پڑھا کہ خود تصویر ہو گئے۔ "نہ پاؤں میں طاقت" کہتے ہوئے اُٹھے۔ مگر پاؤں نے یاری نہ کی لڑکھڑا کر بیٹھ گئے۔ "نہ ہاتھوں میں طاقت" کہہ کر ہاتھ اُٹھائے مگر ضعف سے وہ بھی کچھ یوں ہی سے اُٹھ کر رہ گئے۔ دوسرا مصرع ذرا تیز پڑھا۔ تیسرا مصرع پڑھتے وقت اس طرح بیٹھ گئے جیسے کوئی بے دست و پا سرِ راہ بیٹھ کر صدا لگاتا ہے۔ اور ایک دفعہ ہی دونوں آنکھوں کو آسمان کی طرف اُٹھا کر جو چوتھا مصرع پڑھا تو یہ معلوم ہوتا تھا گویا ساری مجلس پر جادو کر دیا۔ ہر ایک کے مُنہ سے تعریف کے بجائے بے ساختہ یہی نکل گیا کہ "اللہ والی ہے بے دست و پا کا۔" اُستاد ذوق نے کہا۔ "اُستاد یہ خدا کی دین اور خواجہ میر درد کا فیض ہے۔ سبحان اللہ! کیا موثر کلام ہے۔ ہم دنیاداروں میں یہ اثر پیدا ہونے کے لیے میر درد ہی جیسا اُستاد چاہیے۔"

اس کلام کے بعد مرزا غلام محی الدین آشکی کی غزل بھلا کون سنتا۔ یہ شاہ عالم بادشاہ غازی کے پوتے ہیں۔ کوئی ۴۰ سال کی عمر ہے، اونچا قد، سفید پوش، ثقہ صورت، آدمی ہیں۔ پہلے نظام الدین ممنون سے اصلاح لیتے تھے۔ اب مفتی صدر الدین کے شاگرد ہو گئے ہیں۔ لکھا تھا

کچھ وجہ نہیں نغمۂ مطرب ہی پہ موقوف　　　کافی ہے یہاں نالہ بے ربط درا کا
سجدے میں گرے دیکھ کے تصویر بت اشکی　　　معلوم ہوا آپ کا خرقہ تھا ریا کا

ان کے بعد شمع صاحبزادہ عباس علی خاں بیتاب کے سامنے آئی۔ ۳۰، ۳۲ کا سن ہوگا۔ رامپور کے رہنے والے اور مومن خاں کے شاگرد ہیں۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سے بڑی دوستی ہے انھی کے ساتھ مشاعرے میں آگئے تھے۔ بڑی اونچی آواز میں غزل پڑھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تحت اللفظ پڑھ رہے ہیں۔ غزل تو کچھ اچھی نہ تھی۔ مگر قطعہ ایسا تھا کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ میخانے کی تقسیم ایسی خوبی سے کی تھی کہ سبحان اللہ۔ ہائے لکھا ہے۔

معمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ　　ق　ساقی اگر نہیں ہے نہ ہوئے سے کام ہے
بیتاب پی خدا نے تجھے بھی دیے ہیں ہاتھ　　　یہ خم ہے، یہ سبو ہے، یہ شیشہ، یہ جام ہے

بھلا ایسے بڑے مشاعرے میں مرزا فخرالدین حشمت کو پڑھنا کیا ضرور تھا، نہ کلام ہی اچھا نہ پڑھنے کی طرز ہی اچھی۔ مگر ان کو روک کون سکتا تھا۔ شہزادے تھے اور وہ بھی شاہ عالم بادشاہ کے پوتے۔ خیر پڑھ لیا اور بھائی بندوں نے تعریفیں بھی کردیں۔ خوش ہوگئے۔ غزل یہ تھی۔

ترے بیمار ہجراں کا ترے بن　　　یہ عالم ہے کہ عالم نوحہ گر ہے
مجھے روتے جو دیکھا ہنس کے بولے　　　مرے حشمت بتا کیوں چشم تر ہے

ہاں ان کے بعد جس کے سامنے شمع آئی وہ نوجوان سہی مگر شاعر ہے، اور ایسا شاعر ہوگا ہندوستان بھر میں نام کرے گا۔ بھلا کونسا مشاعرہ ہے جس میں مرزا قربان علی بیگ سالک کی غزل شوق سے

نہیں سنی جاتی اور کونسا شعر ہوتا ہے جو بار بار نہیں پڑھوایا جاتا۔ جو ایک دفعہ بھی کسی مشاعرے میں گیا ہے وہ ان کو دور سے پہچان لے گا۔ چھوٹا سا قد، دُبلے پتلے ہاتھ پاؤں، موٹی سی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ موٹی جلد، گندمی رنگ اس پر چیچک کے داغ، چھدری چھوٹی سی ڈاڑھی۔ کلوں پر کم، ٹھوڑی پر ذرا زیادہ، سر پر خشخاشی بال، کوئی ۳۰ سال کی عمر۔ بس بخارا کے ترک معلوم ہوتے ہیں، ہاں۔ لباس ان لوگوں سے مختلف ہے۔ نیچی چولی کا انگرکھا۔ تنگ مہری کا پیجامہ، سر پہ سفید گول ٹوپی۔ ہاتھ میں سفید لٹھے کا رومال۔ شمع کا ان کے سامنے آنا تھا کہ سب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اُنھوں نے بھی انگرکھے کی آستینیں اُلٹ ٹوپی کو اچھی طرح جما اپنے اُستاد مرزا غالب کی طرف دیکھا۔ ادھر سے مسکرا کر کچھ اشارہ ہوا تو اُنھوں نے صاحب عالم کی طرف دیکھ کر عرض کی۔ "اجازت ہے" مرزا فخرو نے کہا "ہاں۔ میاں سالک پڑھو۔ آخر اس میں اجازت کی ضرورت ہی کیا ہے"۔ سالک نے جیب میں سے کاغذ نکالا، کچھ اُلٹا پلٹا پھر ایک بار سنبھل کر کہا، عرض کیا ہے۔

انتہا صبر آزمائی کی — ہے درازی شبِ جدائی کی
ہے بُرائی نصیب کی، کہ مجھے — تم سے اُمید ہے بھلائی کی
نقش ہے سنگِ آستاں پہ ترے — داستاں اپنی جبہ سائی کی
ہے فغاں بعد امتحانِ فغاں — پھر شکایت ہے نارسائی کی
کیا نہ کرتا وصال شادیِ مرگ — تم نے کیوں مجھ سے بیوفائی کی
راز کھلتے گئے مرے سب پر — جس قدر اس نے خودنمائی کی

کتنے عاجز ہیں ہم کہ پاتے ہیں — بندے بندے میں بو خدائی کی
رہ گئیں دل ہی میں حسرتیں سالک — آ گئی عمر پارسائی کی

ایک ایک شعر پر یہ عالم تھا کہ مجلس لوٹی جاتی تھی ایک ایک شعر کئی کئی بار پڑھوایا جاتا تھا۔ ایک ایک لفظ پر تعریفیں ہوتیں۔ اور ایک ایک بندش کی داد ملتی۔ اُستاد ذوقؔ نے تیسرے شعر پر کہا۔ ”واہ میاں سالک کیا کہنا ہے سب ہی جبہ سائی باندھتے آئے ہیں۔ تمہاری داستان کو کوئی نہیں پہنچا کیا روانی ہے سبحان اللہ۔ حکیم مومن خاں نے کہا۔ ”میاں سالک یہ جوانی اور مقطع میں یہ بوڑھا مضمون، تمہاری ”عمر پارسائی“ کو بہت دن پڑے ہیں ابھی سے تو بوڑھوں کی باتیں نہ کیا کرو۔“ میاں سالک نے جواب دیا۔ اُستاد میں تو جوانی ہی میں بڈھا ہو گیا، دیکھئے بڑھاپا دیکھنا بھی نصیب ہوتا ہے یا نہیں، پھر دل میں آئے ہوئے مضمون کیوں چھوڑ دوں، بعد میں یہ کون دیکھتا پھرے گا کہ یہ شعر بڈھے نے کہا تھا یا جوان نے۔ ہم نہ رہیں گے مضمون رہ جائے گا۔“

جب تعریفوں کا سلسلہ ذرا رکا تو شمع مرزا رحیم الدین ایجادؔ کے سامنے آئی یہ شہزادے مرزا حسین بخش کے صاحبزادے اور مولانا صہبائی کے شاگرد ہیں۔ کوئی ۲۴، ۲۵ سال کی عمر ہے۔ شعر کہتے ہیں مگر پھیکے۔ ہاں پڑھتے بڑی اچھی طرح ہیں گانا خوب جانتے ہیں۔ ان کی کمزوری ظاہر ہونے نہیں دیتی۔

بت خانے میں تھا یا کہ ہیں کعبے کے قریں تھا — اے زاہد ناداں تجھے کیا ہے میں کہیں تھا
ہر چند کہ میں دوست کے ہمراہ نہیں تھا — پر دل وہ بلا ہے کہ وہ جہاں تھا یہ وہیں تھا

توڑا ہے یہ کچھ آپ کو میں نے کہ جہاں میں ثابت نہ رہا نام کا جو میرے نگیں تھا
غزل میں تو کیا خاک مزا آتا۔ ہاں، اُن کے گانے میں مزہ آگیا۔
گا کر پڑھنے کا یہ نیا رنگ قلعہ سے چلا ہے، مگر اُستادان فن اس کو
پسند نہیں کرتے۔

ان کے بعد شمع نواب علاء الدین خاں علائی کے سامنے آئی۔
انھوں نے بہت اُونچی آواز میں اپنی غزل سُنائی۔ علائی مرزا غالب
کے بڑے چہیتے شاگرد ہیں ابھی نوعمر ہیں شعر اچھا کہتے ہیں۔ کیوں
نہ ہو کس کے شاگرد ہیں۔

غزل دیکھ لو اُستاد کا رنگ غالب ہے۔

آوارگان گل کدہ آرزو و | حاشا اگر تمھیں سر سیر و فراغ ہے
رکھیو سنبھل کے پاؤں جو بینا ہو چشم دل | کیجو سمجھ کے کام جو روشن دماغ ہے
وہ گل جو آج ہے قدح موج خیز رنگ | وہ لالہ جو کہ باغ کا چشم و چراغ ہے
گل جو رکل ہے سنگ جفائے سپہر سے | گویا کہ غمکدہ کا شکستہ ایاغ ہے
اور لالہ تند بادِ حوادث سے خاک و خوں | گویا دل و جگر کا کسی کے وہ داغ ہے
جس جا کہ تھا ترانۂ بلبل نشاط خیز | اس جا پہ آج دلشکن آواز زاغ ہے
مغرور جاہ سے یہ کہو تم علائیا | کل ایک سطح خاک ہے جو آج باغ ہے

علائی کے پاس سے شمع کا ہٹ کر سامنے آنا تھا کہ مرزا کریم الدین
رسا سنبھل کر بیٹھ گئے ایک بڑی لمبی غزل پڑھی مگر ساری کی ساری
بے مزہ، نہ الفاظ کی بندش اچھی نہ مضامین میں کوئی خوبی۔ تعقیدوں
سے اُلجھن پیدا ہوتی تھی اور رعایت لفظی سے جی گھبراتا تھا۔ ان کے
بس دو ہی شعر نمونہ کے طور پر لکھ دینا کافی سمجھتا ہوں۔

باز آ۔ ستا تو مجھ کو بہت عشوہ گر نہیں کرتا کسی پہ ظلم کوئی اس قدر نہیں
گو نزع میں ہوں میں ترے بن آئے جانِ من کرنے کی جان ابھی مرے تن سے سفر نہیں

یہ پڑھ چکے تو نواب ضیاء الدین خاں نیّر و رخشاں کے پڑھنے کی باری آئی فارسی کے شعر خوب کہتے ہیں، اردو کی غزلیں ذرا پھیکی ہوتی ہیں۔ لکھا تھا۔

پی کے گرنے کا ہے خیال ہمیں ساقیا لیجیو سنبھال ہمیں
شب نہ آئے جو اپنے وعدہ پر گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں
دل میں مضمر ہیں معنی باقی کسی صورت نہیں زوال ہمیں
ترے غصہ نے ایک دم میں کیا مردہ نہ ہزار سال ہمیں
طالع بد سے نیّر رخشاں اپنے ہی گھر میں ہے وبال ہمیں

ان کے بعد شمع مرزا پیارے رفعت کے سامنے آئی۔ یہ سلاطین زادے ہیں۔ بٹیریں لڑانے کا بہت شوق ہے، شعر بھی خوب کہتے ہیں، پڑھتے بھی خوب ہیں، پہلے احسان کے شاگرد تھے اور اب مولانا صہبائی سے تلمذ ہے، کوئی ۳۰ سال کی عمر ہوگی۔ لکھا تھا۔

بسانِ طائرِ رنگِ پریدہ وحشت سے کسے دماغ ہے اب آشیاں بنانے کا
نہ عذر تھا ہمیں ہونے میں خاک کے گر ہم نہ جانتے کہ وہ دامن نہیں بچانے کا
گندھی تھی کون سے بدمست تشنہ لب کی وہ خاک کہ جس سے خم یہ بنا ہے شراب خانے کا
بذوق۔ ناز کو دے رخصتِ جفا کہ یہاں ہمیں بھی عزم ہے طاقت کے آزمانے کا
ہیں ایک وہ بھی کہ تم سے ہی جن کو راز و نیاز اور ایک ہم ہیں کہ سکتے ہیں منہ زمانے کا

آخری شعر میں مایوسی کی جو تصویر کھینچی ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ کوئی نہ تھا جو اس شعر کے دوسرے مصرع کو پڑھ پڑھ کر نہ جھومتا

ہو۔ اور بار بار واہ واہ اور سبحان اللہ نہ کہتا ہو۔ ہوتے ہوتے میاں عارف کا نمبر آ ہی گیا۔ بھلا ان کو مشاعرے کے انتظام سے کب فرصت تھی جو غزل لکھتے پھر بھی چلتے پھرتے کچھ لکھ ہی لیا تھا وہی پڑھ دیا۔ اس دن رات کی گردش کے بعد اتنا بھی لکھ لینا کمال ہے۔ غزل تھی۔

اٹھتا قدم جو تکے کو، لے نامہ بر نہیں ... پیچھے تو چھوڑ آئے کہیں اُس کا گھر نہیں

اوروں کو ہو تو ہو، ہمیں مرنے سے ڈر نہیں ... خط لے کے ہم ہی جاتے ہیں گر نامہ بر نہیں

بے التفاتیوں کا تری شکوہ کیا کریں ... اپنے ہی جبکہ نالۂ دل میں اثر نہیں

مطلع کی سب نے تعریف کی استاد احسان نے کہا: "میاں عارف! میں بھی شعر کہتے کہتے بڈھا ہو گیا ہوں لاکھوں سنائے مگر یہ مضمون بالکل نیا ہے اور کس خوبی سے ادا کیا ہے کہ دل خوش ہو گیا۔"

میاں عارف کے بعد شمع مرزا غلام نصیر الدین عرف مرزا مغلے کے سامنے آئی یہ شہزادے ہیں، احسان کے شاگرد ہیں اور قناعت تخلص کرتے ہیں۔ غزل خاصی کہتے ہیں۔ میں تو بھی کہوں گا شہزادوں میں بہت کم ایسے شاعر ہوں گے۔ غزل تھی۔

شوق کو کثرتِ نظارہ سے رشک آتا ہے ... حشر سے پہلے میسر ہو وہ دیدار مجھے

کعبے تک جانے میں تھی خاطرِ زاہد ورنہ ... دیر میں بھی تھی سدا رخصتِ بیدار مجھے

جنس دزدیدہ کے مانند ہی الجھاؤں جان ... کہ نہ لیتا ہے نہ پھیرے ہے خریدار مجھے

رازِ دل لب پہ نہ لانا کبھی منصور کی ہاں ... کر دیا بات کے کہنے نے گنہگار مجھے

شمع کا حکیم آغا جان عیش کے سامنے آنا تھا کہ لوگوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ حکیم صاحب بادشاہی اور خاندانی طبیب ہیں، زیورِ علم سے آراستہ اور [illegible]

کلام، شگفتہ صورت۔ جب دیکھو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسکرا رہے ہیں طبیعت
ایسی ظریف و لطیف اور لطیفہ سنج پائی ہے کہ سبحان اللہ میانہ قد، خوش
اندام، سر پر ایک ایک انگل بال سفید، ایسی ہی ڈاڑھی۔ اس گوری
سرخ و سفید رنگت پر کیا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ گلے میں ململ کا کرتا جیسے
چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔ مگر کچھ دنوں سے اُن کے دوست بھی
ان سے ذرا کھنچ گئے تھے۔ میاں ہدہد کو پال کر انھوں نے سب سے
بگاڑ لی۔ شروع شروع میں تو اس کی واہی تباہی باتوں پر کسی نے
دھیان نہیں کیا لیکن جب اس نے اُستادوں پر حملے شروع کیے اُس
وقت سے ہدہد کے ساتھ ہی حکیم صاحب سے بھی لوگوں کو کچھ نفرت سی
ہوگئی۔ غضب یہ کیا کہ اجمیری دروازے والے مشاعرے میں خود انھوں
نے مرزا نوشہ پر کھلا ہوا حملہ کر دیا ایک قطعہ لکھا تھا کہ۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے — مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور کلام میرزا سمجھے — مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اس پر مولوی مملوک العلی نے کہا۔ "حکیم صاحب شعر کے سمجھ میں
نہ آنے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو شعر ہی بے معنی ہے یا سمجھنے والے
کے دماغ کا قصور ہے۔ ہم سب تو ان کے شعر سمجھتے ہیں، پھر اپنے
ساتھ آپ نے ہم غریبوں کو کیوں لپیٹ لیا؟" مومن خاں نے کہا "بھئی۔
مجھے تو اس قطعے کے تیسرے مصرع میں بھی شاعرانہ تعلّی معلوم ہوتی ہے۔"
بہر حال بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا۔ اس معرکہ کے بعد یہ دوسرا
موقع تھا کہ حکیم صاحب مشاعرے میں تشریف لائے تھے۔ میر صاحب
[illegible] جنگ کیا تھا وہ سُن چکے تھے۔ اب

لوگوں میں جو کانا پھوسی ہونے لگی اِس سے اور بھی پریشان ہوئے پڑھنے میں تامل کیا آخر مرزا فخرو کے اصرار پر یہ غزل پڑھی۔

صُلح اُن سے ہمیں کیے ہی بنی	دل پہ جھگڑا تھا دل دیے ہی بنی
زہد و تقوے دھرے رہے سارے	ہاتھ سے اُس کے مے پیے ہی بنی
لائے وہ ساتھ غیر کو ناچار	پاس اپنے بٹھا لیے ہی بنی
کس کا تھا پاس شوق ظلم اے عیش	اُن جفاؤں پہ بھی جیے ہی بنی

جب ایسی غزل ہو تو بھلا کون تعریف نہ کرے صلِ علیٰ کے شور اور سُبحان اللہ کی آوازوں نے پڑھنے والے اور سننے والوں دونوں کے دلوں سے غبار کدورت دُور کر دیا اور حکیم صاحب وہی حکیم صاحب ہو گئے جو پہلے تھے۔ نہ ان سے کسی کو رنج رہا اور نہ اُن کو کسی سے ملال۔ ہاں اگر پہلے کہیں میاں ہدہد چٹک جاتے تو خدا معلوم مشاعرے کا کیا رنگ ہو جاتا۔ وہ تو خدا بھلا کرے ہمارے میر صاحب کا کہ اُنھوں نے پہلے ہی اس بکھیرو کی زبان بند کر دی۔ خیر۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔

حکیم صاحب کے بعد مرزا رحیم الدین حیاؔ کا نمبر آیا۔ یہ وہی میاں حیا ہیں جن کی تعریف مشاعرے میں آتے ہی ان کے والد صاحب قبلہ مرزا کریم الدین رسؔا نے فرمائی تھی۔ بڑے خوش طبع، ذہین، نیک فطرت، بدیہہ گو اور ظریف آدمی ہیں کوئی ۳۵ ۔ ۳۶ سال کی عمر ہے۔ اکثر بنارس میں رہتے ہیں۔ کبھی کبھی دہلی چلے آتے ہیں۔ شکل تو بالکل شاہزادوں کی ہے مگر ڈاڑھی منڈھی ہوئی اور لباس لکھنو والوں کا سا۔ پہلے اپنے والد کے شاگرد ہوئے۔ پھر شاہ نصیر

سے اصلاح لی اب اپنا کلام اُستاد ذوق کو دکھاتے ہیں۔ شطرنج بے مثل کھیلتے ہیں، پہلے حکیم شرافت علی خاں سے سیکھی اب مومن خاں کو گھیرے رہتے ہیں ستار ایسا بجاتے ہیں کہ سبحان اللہ۔ شاعر بھی اچھے ہیں مگر محنت نہیں کرتے زبان کی چاشنی پر مضمون کو نثار کر دیتے ہیں۔ یہ غزل لکھ کر لائے تھے۔

موت ہی چارہ ساز فرقت ہے   رنج مرنے کا مجھ کو راحت ہے
ہو چکا قول، وقت رخصت ہے   اے اجل جلد آ۔ کہ فرصت ہے
روز کی داد کون دیوے گا   ظلم کرنا تمھاری عادت ہے
کارواں عمر کا ہے رخت بدوش   ہر نفس بانگِ کوس رحلت ہے
سانس اک پھانس سی کھٹکتی ہے   دم نکلتا نہیں مصیبت ہے
تم بھی اپنے حیا کو دیکھ آؤ   آج اس کی کچھ اور حالت ہے

پانچویں شعر پر ان کے والد نے ٹوکا اور کہا "میاں حیا! لکھنؤ جا کر اپنی شکل تو بدل آئے تھے اب زبان بھی بدل دی، سانس کو مونث باندھ گئے۔" حیا نے جواب دیا۔ "جی نہیں قبلہ میں نے تو اُستاد ذوق کی تقلید کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ "سینے میں سانس ہو گی اڑی دو گھڑی کے بعد"۔ بھلا صاحبِ[1] عالم کب چوکنے والے تھے، کہنے لگے۔ "بھلا ہمارے مقابلے میں آپ کے اُستاد کا کلام کہیں سند ہو سکتا ہے۔ وہ۔ جو چاہیں لکھیں، یہ بتاؤ قلعے میں سانس مذکر ہے یا مؤنث۔" بیچارے حیا مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

---

[1] قلعے والوں کو خواہ وہ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے، صاحبِ عالم کہا جاتا تھا۔

اب شمع مولانا صہبائی کے روبرو آئی۔ ان کی علمیت کا ڈنکا تمام ہندوستان میں بج رہا ہے۔ ایسے جامع الکمال آدمی کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ ہزاروں شاگرد ہیں۔ اکثر ریختہ کہتے ہیں۔ ان کو اصلاح دیتے ہیں۔ مگر خود ان کا کلام تمام و کمال فارسی ہے۔ میں نے تو ریختے میں نہ کبھی ان کی کوئی غزل دیکھی نہ سُنی۔ اس مشاعرے میں بھی فارسی ہی کی غزل پڑھی خوب خوب تعریفیں ہوئیں۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ لوگوں کو مزہ نہ آیا۔

ہمچو شبنم خویش را فارغ ز عالم ساختم | محرم خورشید گشتم با خساں کم ساختم
مرزم و در چشم مردم عالمے تاریک گشت | من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم
کفر در کیشم سپاس نعمت دیدار اوست | جلوہ در ہر رنگ دیدم گردنے خم ساختم
جرم عشقم را جزا شد جور دمن زہر دوست | داغ بر دل بردم و خلدش جہنم ساختم
نیست صہبائی چو جام جم نصیبم گو مباش | مے ز خونِ دل کشیدم خویش را جم ساختم

مقطع پر تو اتنی تعریفیں ہوئیں کہ بیان سے باہر ہے۔ مگر جو بیچارے فارسی نہیں سمجھتے تھے وہ بیٹھے منہ دیکھا کیے۔ صاف بات تو یہ ہے کہ اُردو کے مشاعرے میں فارسی کا ٹھونسنا کچھ مجھے بھی پسند نہ آیا۔

اہا ہا ہا! زبان کا لُطف اُٹھانا ہے تو اب سید ظہیر الدین خاں ظہیر کو سُنیے۔ ابھی ۳۰-۳۲ سال کی عمر ہے۔ مگر کلام میں خدا نے وہ اثر دیا ہے کہ واہ واہ۔ اُستاد ذوق کی اصلاح نے اور سونے پر سُہاگے کا کام کیا ہے۔ شکل و صورت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی طبیعت اِس بلا کی ہے۔ قد خاصا اونچا، چھریرا بدن، کشادہ

سینہ، سانولی رنگت، کشادہ دہن اونچی ستوان ناک، آنکھیں نہ بہت بڑی نہ بہت چھوٹی۔ گول ڈاڑھی نہ بہت گھنی نہ بہت چھدری، سر پر پٹے۔ لباس میں انگرکھا، تنگ مہری کا، سُفید گول ٹوپی، خوش مزاج اور لطیفہ سنج ایسے کہ مُنہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ پڑھنے کا بھی ایک خاص طرز ہے۔ لکھنؤ والوں کے تحت اللفظ پڑھنے سے ملتا جلتا ہے۔ ساتھ ہی اشاروں سے ایک ایک لفظ کو سمجھاتے جلتے ہیں۔ غزل ہوئی تھی۔

جبیں، اور شوق اُس کے آستاں کا — ارادہ، اور ارادہ بھی کہاں کا

لٹا ہے قافلہ تاب و تواں کا — خدا حافظ ہے دل کے کارواں کا

مری واماندگی منزل رساں ہے — سُراغ نقش پا ہوں کارواں کا

رہے پابند دل کے دل میں ارماں — قدم منزل نے پکڑا کارواں کا

اُٹھا سکتے نہیں سر آستاں سے — غضب ہے بار منت پاسباں کا

ہمیشہ مورد برق و بلا ہوں — مٹے جھگڑا الٰہی آشیاں کا

دل بیتاب نے وہ بھی مٹایا — کسی کو کچھ تو دھوکا تھا فغاں کا

ظہیر آؤ چلو اب میکدے کو — نکالا زہد و تقوے نے ہے کہاں کا

اور تو اور اُستادانِ فن نے اس غزل کی ایسی داد دی کہ میاں ظہیر کا دل غنچے کی طرح کھل گیا۔ تیسرے شعر پر تو یہ حالت تھی کہ تعریفوں کا سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ سلام کرتے کرتے بیچارے کے ہاتھ دُکھ گئے ہونگے۔ جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی جانب کی شمع نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے سامنے آئی اُن کا کیا کہنا۔ اُستادانِ فن میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مومن کے شاگرد ہیں مگر خود اُستاد ہیں

اُنھوں نے کسی شعر کی تعریف کی اور اس کی وقعت بڑھی، یہ سُن کر ذرا خاموش ہوئے اور شعر دوسروں کی نظر سے بھی گر گیا۔ زبان کے ساتھ مضمون کو ترتیب دینا ایسے ہی لوگوں کا کام ہے۔ پڑھتے بھی ہیں تو ایک ایک لفظ سمجھا سمجھا کر۔ آواز ایسی اونچی ہے کہ دُور اور پاس سب کو صاف سُنائی دے۔ غزل پڑھنے سے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا ذرا انگرکھا درست کیا، ٹوپی درست کی انگرکھے کی آستینوں کو چڑھایا اور یہ غزل پڑھی۔

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں — گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں
سب اس میں محو اور یہ سب سے علیحدہ — آئینہ میں ہے آب نہ آئینہ آب میں
ذات و صفات میں بھی یہی ربط چاہیے — جوں آفتاب در روشنی آفتاب میں
وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا — وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں
بیباک شیوہ، شوخ طبیعت زباں دراز — ملزم ہوا ہے، پر نہیں عاجز جواب میں
تکلیف شیفتہ ہوئی تم کو، مگر حضور — اس وقت اتفاق سے وہ ہیں عتاب میں

غزل تو ایسی ہے کہ بھلا کسی کا مُنہ ہے جو تعریف کا حق ادا کرسکے، مگر تعریف بڑی سنبھل سنبھل کر کی گئی۔ بڑے مشاعروں میں میں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ نومشقوں کے دل تو ہمیشہ تعریفوں سے خوب بڑھاتے ہیں۔ مگر جب اُستادوں کے پڑھنے کی نوبت آتی ہے تو وہ جوش و خروش نہیں رہتا۔ بلکہ جوش کے بجائے متانت زیادہ آجاتی ہے۔ اُستادوں کے اُنھیں شعروں کی تعریف ہوتی ہے جو واقعی قابلِ تعریف ہوں اگر کسی شعر کی ذرا بیجا تعریف کر دی جائے تو اس سے ان کو تکلیف ہوتی ہے۔ یہ صرف اسی کلام کی تعریف چاہتے ہیں جس کو یہ خود

سمجھتے ہیں کہ اس کی تعریف ہونی چاہیے۔ شعر پڑھ کر اگر دیکھتے بھی ہیں تو اپنے برابر والوں کی طرف اور وہی داد بھی دیتے ہیں۔ مشاعرے کے باقی لوگ ان کے کلام سے لطف ہی نہیں اُٹھاتے کچھ حاصل بھی کر لیتے ہیں اور ان کے لیے یہ غزلیں اُستاد کی اصلاح سے کم فائدہ مند نہیں ہوتیں۔

اس کے بعد شہزادہ مرزا قادر بخش صابر کی باری آئی۔ یہ کوئی ۴۰ برس کے ہوں گے۔ ان کی شاعری کی قلعہ میں بڑی دھوم ہے، خود ان کو بھی اپنے کلام پر ناز ہے۔ شعرائے دہلی کا ایک تذکرہ لکھ رہے ہیں۔ مگر مشہور یہ ہے کہ الف سے لے کر یے تک مولانا صہبائی کا قلم ہے۔ یہ سچ ہے یا جھوٹ خدا بہتر جانتا ہے۔ خود اُنھوں نے اپنے حالات ایک قطعہ میں لکھے ہیں، وہ نقل کرتا ہوں۔

قطعہ

پہلے اُستاد تھے احسان و نصیر و ممنون ہوئی احسان سے پر اصلاح طبیعت میری
پھر ہوا حضرتِ صہبائی کی اصلاح کا فیض طبع باریک ہوئی اُن کی بدولت میری
اور ہم بزم رہے مومن و ذوق و غالب اوستادوں ہی سے ہر دم رہی صحبت میری
ہند کا فضل و ہنر ذات تھی جن کی تمام مانتے ہیں وہی اشخاص فضیلت میری
منعقد ہوتی ہے جب شہر میں بزمِ انشا کرتے ہیں اہلِ سخن وقعت و عزت میری

اب اس کلام پر ان کو اُستاد کہو یا جو چاہے کہو۔ غزل میں بھی یہی پھیکا رنگ ہے، مضمون بھی کچھ بلند پایہ نہیں ہیں، مگر سارا
[illegible]

غزل کہی تھی۔

نظارہ برقِ حسن کا دشوار ہوگیا — جلوہ حجابِ دیدۂ بیدار ہوگیا
محفل میں، میں تو اس بتِ مےگوں کے سامنے — نامِ شراب لے کے، گنہگار ہوگیا
حائل ہوئی نقاب تو ٹھہری نگاہِ شوق — پردہ ہی جلوہ گاہِ رخِ یار ہوگیا
معلوم یہ ہوا کہ ہے پرسش گناہ کی — عاصی گنہ نہ کردہ، گنہگار ہوگیا
اس کی گلی میں آکے کیا کیا اٹھائے رنج — خاکِ شفا ملی تو میں بیمار ہوگیا
پیری میں ہم کو قطعِ تعلق ہوا نصیب — قامت خمیدہ ہوتے ہی تلوار ہوگیا

یہ پڑھ چکے تو شمع مفتی صدرالدین صاحب آزردہ کے سامنے پہنچی۔ اس پائے کے عالم شاعر نہیں ہوتے اور ہوتے ہیں تو اُستاد ہو جاتے ہیں۔ مفتی صاحب کے جتنے شاگرد جید عالم ہیں اس سے کہیں زیادہ ان کے تلامذہ شاعر ہیں اور شاعر بھی کیسے کہ بڑے پلے کے۔ مفتی صاحب کہتے تو خوب ہیں مگر پڑھتے اس طرح ہیں گویا طالب علموں کو سبق دے رہے ہیں۔ آواز بھی ذرا نیچی ہے لیکن ان کی وجاہت کا یہ اثر ہے کہ مشاعرے میں سناٹا ہو جاتا ہے، اور تعریف بھی ہوتی ہے تو خاص خاص شعروں پر اور بہت نیچی آواز میں۔ ہاں مرزا نوشہ اُن سے مذاق کرنے میں نہیں چوکتے۔ کبھی کبھی اعتراض بھی کر بیٹھتے ہیں۔ اور مزے مزے کی نوک جھونک ہو جاتی ہے۔ غزل ملاحظہ ہو۔ کیا پختہ کلام ہے۔

نالوں سے میرے کب تہ و بالا جہاں نہیں — کب آسماں زمین و زمیں آسماں نہیں
افسردہ دل نہ ہو، درِ رحمت نہیں ہے بند — کس دن کھلا ہوا درِ پیرِ مغاں نہیں
شب اُس کو حالِ دل نے جتایا کچھ اس طرح — ہیں لب تو کیا نگہ بھی ہوئی ترجماں نہیں

اے دل، تمام نفع ہے سودائے عشق میں — اک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں
کٹتی کسی طرح بھی نہیں یہ شبِ فراق — شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں
کہتا ہوں اُس سے کچھ، میں نکلتا ہے منہ سے کچھ — کہنے کو یوں تو، ہے گی زباں اور زباں نہیں
آزردہ ہونٹ تک نہ ملے اس کے روبرو — مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں

آزردہ جیسے اُستاد کے بعد نواب مرزا خاں داغ کا پڑھنا ایک عجیب سی چیز ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ اول تو داغ کو سب چاہتے ہیں، دل بڑھاتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کسی دن یہی داغ ہندوستان کا چراغ ہوگا۔ دوسرے مرزا فخرو کے خیال سے ان کو اُستادوں میں جگہ ملی تھی۔ مگر انھوں نے غزل بھی ایسی پڑھی کہ اُستاد بھی قائل ہو گئے۔ ۱۸، ۱۹ برس کے لڑکے کا اس قیامت کی غزل اور اس جرأت سے پڑھنا واقعی کمال ہے میری تو یہ رائے ہے کہ جو زبان داغ نے لکھی ہے وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوگی۔ ذرا زبان کی شوخی، مضمون کی رنگینی، اور طبیعت کی روانی ملاحظہ کیجیے اور داد دیجیے۔

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں — ناز والے نیاز کیا جانیں
شمع رو آپ گو ہوئے لیکن — لطفِ سوز و گداز کیا جانیں
کب کسی در کی جبہ سائی کی — شیخ صاحب نماز کیا جانیں
جو رہِ عشق میں قدم رکھیں — وہ نشیب و فراز کیا جانیں
پوچھیے میکشوں سے لطفِ شراب — یہ مزہ پاک باز کیا جانیں
جن کو اپنی خبر نہیں اب تک — وہ مرے دل کا راز کیا جانیں
حضرتِ خضر جب شہید نہ ہوں — لطفِ عمرِ دراز کیا جانیں
جو گذرتے ہیں داغ پر صدمے — آپ بندہ نواز کیا جانیں

اللہ، اللہ! وہ سہانا وقت، وہ چھوٹی سی آواز، وہ دلکش سُر وہ الفاظ کی نشست و بندش کی خوبصورتی اور سب سے زیادہ یہ کہ داغ کی بھولی بھولی شکل، ایک عجیب لطف دے رہی تھی۔ ساری محفل میں کوئی نہ تھا جو محو حیرت نہ ہو گیا ہو اور کوئی نہ تھا جس کے مُنہ سے جزاک اللہ، سبحان اللہ اور صلِ علیٰ کے الفاظ بے ساختہ نہ نکل رہے ہوں۔ مرزا فخرو کی تو یہ حالت تھی کہ گھڑی گھڑی پہلو بدلتے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے تھے۔ غزل ختم ہوئی اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ کب ختم ہو گئی۔ جب شمع حکیم مومن خاں مومن کے سامنے پہنچ گئی اس وقت لوگوں کا جوش کم ہوا۔ اور اس ریختے کے اُستاد کا کلام سننے کو سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ اُنھوں نے شمع کو اُٹھا کر ذرا آگے رکھا۔ ذرا سنبھل کر بیٹھے۔ بالوں میں اُنگلیوں سے کنگھی کی، ٹوپی کو کچھ ترچھا کیا۔ آستینوں کی چنٹ کو صاف کیا اور بڑی درد انگیز آواز میں دلپذیر ترنم کے ساتھ یہ غزل پڑھی۔

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

بہرِ عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ
دم ہی نکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

سو زندگی نثار کروں ایسی موت پر
یوں روئے زار زار تو اہلِ عزا کے ساتھ

بے پردہ غیر پاس اسے بیٹھا نہ دیکھتے
اُٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ

اُس کی گلی کہاں یہ تو کچھ باغ خلد ہے
کس جائے مجھ کو چھوڑ گئی موت لا کے ساتھ

اللہ رے گمرہی بت و بتخانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

شاعری کیا تھی، جادو تھا۔ تمام لوگ ایک عالم تحیر میں بیٹھے

تھے۔ وہ خود بھی اپنے کلام کا مزا لے رہے تھے۔ جس شعر میں ان کو زیادہ لطف آتا تھا اس کو پڑھتے وقت ان کی اُنگلیاں زیادہ تیزی سے بالوں میں چلنے لگتی تھیں۔ بہت جوش ہوا تو زلفوں کو انگلیوں میں بل دے کر موڑنے لگے۔ کسی نے تعریف کی تو گردن جُھکا کر ذرا مُسکرا دیے۔ پڑھنے کا طرز بھی سب سے جُدا تھا۔ ہاتھ بہت کم ہلاتے تھے اور ہلاتے بھی کیسے، ہاتھوں کو بالوں سے کب فرصت تھی، ہاں آواز کے زیر و بم اور آنکھوں کے اشاروں سے جادو سا کر جاتے تھے۔ غزل ختم ہوئی تو تمام شعراء نے تعریف کی۔ سن کر مُسکرائے اور کہا۔ "آپ لوگوں کی یہی عنایت تو ہماری ساری محنت کا صلہ ہے، میں تو عرض کر چکا ہوں۔

ہم داد کے خواہاں ہیں نہیں طالب زر کچھ   تحسینِ سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا"

اُن کے بعد شمع اُستاد احسان کے سامنے آئی۔ میں سمجھا تھا کہ ان کی آواز کیا خاک نکلے گی۔ مگر شمع کے پہنچتے ہی وہ تو بجلی سی بدل کچھ سے کچھ ہو گئے اور اتنی بلند آواز سے غزل پڑھی کہ تمام مجلس پر چھا گئے۔ کسی شعر پہ مومن خاں کو متوجہ کرتے کسی پر مرزا نوشہ کو، کسی پر اُستاد ذوق کو۔ ان کی عظمت کچھ لوگوں کے دلوں پہ ایسی چھائی ہوئی تھی کہ جس کو اُنھوں نے متوجہ کیا اُس کو تعریف کرتے ہی بنی۔ ردیف سخت، اور قافیہ مشکل تھا۔ مگر ان کی اُستادی کی داد دینی چاہیے کہ ان دشواریوں پہ بھی ساری غزل مرصع کہہ گئے ہیں۔ ہائے لکھتے ہیں۔

[illegible]

بتو بتاؤ تو، کیا تم خدا کو دوگے جواب　　خدا کے بندوں پہ یہ ظلم، بندہ ہائے خدا
رضا پہ تیری ہوں دن رات اے صنم مصروف　　جو اس پہ تو نہیں راضی نہ ہو رضائے خدا
بتوں کے کوچے میں کہتا تھا کل یہی احسان　　یہاں کسی کا نہیں ہے کوئی سوائے خدا

جب یہ پڑھ چکے تو مرزا غالب کی باری آئی۔ یہ رنگ ہی دوسرا تھا۔ صبح ہو چلی تھی۔ شمع کے سامنے آتے ہی فرمانے لگے "صاحبو! میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں یہ کہہ کر ایسے دلکش اور مؤثر لہجہ میں غزل پڑھی کہ ساری محفل محو ہوگئی۔ آواز بہت اونچی اور پُردرد تھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی کو مجلس میں اپنا قدر دان نہیں پاتے اور اس لیے غزل خوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے غزل تھی۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے　　آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار　　یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں　　کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود　　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں　　غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے　　نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں　　ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید　　جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا　　اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں　　میں نہیں جانتا دعا کیا ہے
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب　　مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

[illegible]

اُن سے خدا سمجھے" حکیم آغا جان سمجھ گئے۔ اور کہنے لگے "مرزا صاحب! غنیمت ہے کہ تم اس رنگ کو آخر ذرا سمجھے" غرض تعریفوں کے ساتھ ساتھ مذاق بھی ہوتا رہا۔ اور شمع اُستاد ذوقؔ کے سامنے پہنچ گئی۔ اُستاد نے مرزا فخرو کی طرف دیکھ کر کہا "صاحب عالم۔ غزل پڑھوں یا کل جو قطعہ ہوا ہے وہ عرض کروں۔ کل رات خدا جانے کیا بات تھی کہ کسی طرح نیند ہی نہ آتی تھی، لوٹتے لوٹتے صبح ہوگئی۔ شب ہجر کا مزا آگیا۔ اسی کشمکش میں ایک قطعہ ہوگیا ہے اجازت ہو تو عرض کروں" مرزا فخرو نے کہا "اُستاد، آج کا مشاعرہ سب بندوں سے آزاد ہے، غزل پڑھیئے۔ رباعی پڑھیے۔ قصیدہ پڑھیے۔ قطعہ پڑھیے۔ غرض جو دل چاہے پڑھیے۔ ہاں۔ کچھ نہ کچھ پڑھیے ضرور" اُستاد ذوقؔ سنبھل کر بیٹھ گئے اور یہ قطعہ ایسی بلند اور خوش آیند آواز میں پڑھا کہ محفل گونج اٹھی اور ان کے پڑھنے کے انداز نے کلام کی تاثیر میں اور زیادہ زور پیدا کر دیا۔

کہوں کیا ذوقؔ احوال شب ہجر ۔۔۔ کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر ۔۔۔ مرے بخت سیہ کی تیرگی نے
نہ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم ۔۔۔ اور آتے تھے پسینوں پر پسینے
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے ۔۔۔ کہ او بے مہر، بد اختر کمینے
کہاں میں اور کہاں یہ شب مگر تھے ۔۔۔ مری جانب سے تیرے دل میں کینے
سو اس ظلمت کے پردے میں کیے ظلم ۔۔۔ ارے ظالم، تیری کینہ وری نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج ۔۔۔ پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
جو ۔۔۔ [illegible]

مری سینہ زنی کا شور سن کر | پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے
اٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا | مجھے بیتابی و بے طاقتی نے
کہا جب دل نے، تو کچھ کھا کے سو رہ | بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ | بہت سی جان توڑی جانکنی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی | طلوع صبح سے منہ روشنی نے
کہا جی نے، مجھے یہ ہجر کی رات | یقیں ہے صبح تک دیگی نہ جینے
لگے پانی چوانے منہ میں آنسو | پڑھی یاسیں سرہانے بیکسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی | لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریب خانہ میرے | اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے
بشارت مجھ کو صبح وصل نے دی | اذاں کے ساتھ بہجت و فرحت نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر | کہ خوش ہو کر کہا خود یہ خوشی نے
موذن مرحبا بر وقت بولا | تیری آواز مکے اور مدینے

آخری شعر پر پہنچے تھے کہ برابر کی مسجد سے آواز آئی اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر! اس کے ساتھ ہی سب کے منہ سے نکلا "تری آواز مکے اور مدینے" اذان ختم ہوئی تو سب نے دعا کو ہاتھ اٹھائے۔ دعا سے فارغ ہو کر مرزا فخرو نے کہا "صاحبو! کچھ اتفاق ہے کہ فاتحہ خیر ہی سے یہ مشاعرہ شروع ہوا تھا اور اب فاتحہ خیر ہی پر ختم ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر انھوں نے دونوں شمعوں کو جو چکر کھا کر ان کے سامنے آگئی تھیں بجھا دیا۔ شمعوں کے گل ہوتے ہی نقیبوں نے آواز دی۔

"حضرات! مشاعرہ ختم ہوا۔" یہ سننا تھا کہ چلنے کو سب کھڑے ہو گئے

رخصت ہوگئے آخر میں نواب زین العابدین خاں اور میں رہ گئے۔ میں
سب سے پہلے ان کا شکریہ ادا کیا۔ کہنے لگے میاں کریم الدین یہ تمہاری نیک نیتی
تھی جو اتنا بڑا مشاعرہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔ تمہارا کام بھی بن گیا اور میرا
ارمان بھی نکل گیا۔ اچھا۔ خدا حافظ۔"

ہماری مطبوعات

کنول (اعظم کریوی) چمنستان اُردو کا وہ باغیچہ ہے جس میں بیلا چنبیلی اور موتیا جیسے پھول کھلے ہوئے ہیں ان پھولوں کی نفاست، سادگی اور بیرنگی ہی ہزاروں رنگینیوں کی جان ہے عہ/۱۲

سادہ اور رنگین افسانے محض چند معیاری افسانوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ادب اُردو کے جمود اور رجعت پسندی کے خلاف ایک کوشش بلیغ ہے اس کے مصنف ظفر قریشی ہیں جن کے جدت پسند دماغ کا یہ مرقع ہے عہ/۱۲

خانقاہ ایم اسلم کے نئے اور جدید افسانوں کا مجموعہ جو ہر حیثیت سے قابلِ دید ہے عہ/۱۲

لیلیٰ کے خطوط (مصنفہ قاضی عبدالغفار) چمنستان ادب کا وہ پھول جس کے رنگ و بو کو زوال نہیں۔ ایک حسن فروش فلسفی طوائف کے ان خطوط کا مجموعہ جن پر صحیفۂ اخلاق ناز کر سکتا ہے مصور اور جدید اضافہ کیتا عہ/۱۲

لہو ترنگ سکندر علی وجد بی۔ اے (عثمانیہ) ایچ۔ سی۔ یس کا یہ مجموعہ کلام آپکی فکر و نظر کے لئے ایک دعوت ہے۔ وجد لفظی شاعری کا قائل نہیں اس کے نغمات کے شعلوں میں خواب زندگی کی حقیقی تعبیریں ہیں قیمت اول للعہ دوم عہ/۱۲

مرمر اور خون عزیز احمد صاحب کا مشہور نفسیاتی ناول جسمیں بتایا گیا ہے کہ جذبات پرست امیرزادوں کیلئے مفلسی ایک کھلونا ہے۔ قیمت عہ/۱۲

کارخانہ ظریف فطرت فضل الرحمٰن صاحب کا مزاحیہ ڈرامہ، سرمایہ داری، مزدور اور مزدور کی لیڈری پر عجیب انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ۱۲/